August 2022

وَمَنۡ يَعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسۡتَقِيمٍ

صراطِ مستقیم برمنگھم

بیاد

مولانا فضل کریم عاصم رحمہ اللہ

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

Vol: 42 No. 10 August 2022

Muharram/Safar 1444 AH

جلد: 42 شمارہ: 10 اگست 2022ء

محرم/صفر 1444ھ

فہرست مضامین

Correspondence Address:
SIRAT-E-MUSTAQEEM
20 Green Lane, Small Heath,
Birmingham B9 5DB
Tel: 0121 773 0019
Fax: 0121 766 8779

ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith UK

www.mjah.org.uk/siratemustaqeem

E-mail: info@mjah.org.uk

ہندوستان کے مشہور عالم دین، کہنہ مشق اُستاد، بے باک خطیب اور صاحب طرز مضمون نگار مولانا حافظ حفیظ الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کا 26 مئی مختصر علالت کے بعد چینائی میں انتقال ہوگیا۔

مولانا اعظمی مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے والی پہلی بیچ میں شامل تھے، اکتوبر 1961ء کو جب الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیمی سال کا آغاز ہوا، پہلے سال انڈیا کے 22 طالب علموں کو داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت ایک فیکلٹی کلیۃ الشریعہ اور کچھ ابتدائی تعلیمی شعبے قائم کیے گئے تھے۔یونیورسٹی کے ابتدائی اساتذہ میں نامی گرامی اہل علم تھے، مفتی سعودی عرب علامہ الشیخ عبد العزیز بن باز عقیدہ، علامہ الشیخ محمد الامین الشنقیطی تفسیر اور علامہ الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ حدیث پڑھایا کرتے تھے، ان اسماء گرامی پر ایک نظر ڈالی کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان سے پڑھنے والے شاگردوں کی علمی پختگی کا عالم کیا ہوگا، خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را، اس اہم یونیورسٹی سے 1965ء میں پہلا گروپ فارغ ہوا، ان فارغین میں محترم مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی بھی شامل تھے، شیخ بن باز رحمہ اللہ کے مشورہ کے مطابق 4 سال نائجیریا میں بطور داعی کے اور 4 سال ملیشیاء میں خدمات انجام دیں اور باقی ساری زندگی مادر علمی جنوبی ہند کی مشہور درسگاہ جامعہ دار السلام عمر آباد میں تدریسی اور ادارتی خدمات انجام دیتے رہے، آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث جامعہ کے ناظم بنادیے گئے اور اخیر تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے، اپنے پیچھے شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی جو ان کے لیے ان شاءاللہ صدقہ جاریہ ثابت ہوگی۔

غالباً یہ 1975ء کے اواخر کی بات ہے کہ ہم جامعہ دارالسلام عمرآباد کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے یعنی فضیلت سال اول، نئے تعلیمی سال میں درسی کتابیں جن اساتذہ کے ذمہ ہوتیں، دروس کے آغاز میں اساتذہ اپنے مضمون کا تعارف کرواکر درس شروع کیا کرتے، عموماً یہ تعارف مختصر اور واجبی سا ہوتا، پہلے دن کے درس کے ابتدائی حصہ میں طالب علم کو مضمون اور کتاب کے متعلق ضروری باتیں بتائی جاتیں پھر سبق شروع ہوجاتا، حدیث کی مشہور کتاب سنن ترمذی اس وقت مولانا حفیظ الرحمن اعظمی عمری مدنی حفظہ اللہ پڑھایا کرتے تھے لیکن ہماری حرماں نصیبی کہ استاذ محترم جو اس وقت "حفیظ بھائی" کہلاتے تھے، اور اس لقب میں اتنی حلاوت اور اپنائیت تھی کہ طلبہ اور استاذ محترم کے درمیان القاب کے پردے حائل نہیں تھے، شاید اس لیے استفادہ کے دریچے بھی زیادہ کھلے تھے، جب ہم ساتویں جماعت میں پہنچے تو اس وقت حفیظ بھائی سفر نائیجیریا کے لیے پابہ رکاب تھے اور سفری تاریخ تک ہی اس کلاس میں ہم آپ سے استفادہ کرسکتے تھے، یوں تو ابتدائی درجات سے ہم نے استاذ محترم سے بھرپور استفادہ کیا، لیکن جب عقل وخرد کی پختگی اور شعور کی بالیدگی کی دہلیز پر پہنچے تو استفادہ کا موقع نکل گیا، تاہم ذمہ داران جامعہ نے سوچا ہوگا کہ "مالا يؤخذ كله لايترکه جله" جتنے دن بھی استاذ محترم عمر آباد میں موجود ہیں ان سے استفادہ جاری رہے، یوں ہم نے سنن ترمذی اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا تعارف استاذ محترم سے سنا گویا

غالباً یہ 1975ء کے اواخر کی بات ہے کہ ہم جامعہ دارالسلام عمرآباد کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے یعنی فضیلت سال اول، نئے تعلیمی سال میں درسی کتابیں جن اساتذہ کے ذمہ ہوتیں، دروس کے آغاز میں اساتذہ اپنے مضمون کا تعارف کرواکر درس شروع کیا کرتے، عموماً یہ تعارف مختصر اور واجبی سا ہوتا، پہلے دن کے درس کے ابتدائی حصہ میں طالب علم کو مضمون اور کتاب کے متعلق ضروری باتیں بتائی جاتیں پھر سبق شروع ہوجاتا، حدیث کی مشہور کتاب سنن ترمذی اس وقت مولانا حفیظ الرحمن اعظمی عمری مدنی حفظہ اللہ پڑھایا کرتے تھے لیکن ہماری حرماں نصیبی کہ استاذ محترم جو اس وقت "حفیظ بھائی" کہلاتے تھے، اور اس لقب میں اتنی حلاوت اور اپنائیت تھی کہ طلبہ اور استاذ محترم کے درمیان القاب کے پردے حائل نہیں تھے، شاید اس لیے استفادہ کے دریچے بھی زیادہ کھلے تھے، جب ہم ساتویں جماعت میں پہنچے تو اس وقت حفیظ بھائی سفر نائیجیریا کے لیے پابہ رکاب تھے اور سفری تاریخ تک ہی اس کلاس میں ہم آپ سے استفادہ کرسکتے تھے، یوں تو ابتدائی درجات سے ہم نے استاذ محترم سے بھرپور استفادہ کیا، لیکن جب عقل وخرد کی پختگی اور شعور کی بالیدگی کی دہلیز پر پہنچے تو استفادہ کا موقع نکل گیا، تاہم ذمہ داران جامعہ نے سوچا ہوگا کہ "مالا يؤخذ كله لايترکه جله" جتنے دن بھی استاذ محترم عمر آباد میں موجود ہیں ان سے استفادہ جاری رہے۔

ترمذی سے تو محبت سی ہوگئی پھر اس پر اضافہ مولانا ظہیر الدین رحمانی رحمہ اللہ کے درس کا انداز دوران درس اپنے استاذ گرامی علامہ عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ تحفۃ الاحوذی کے حوالہ سے جب گفتگو کرتے تو گویا یہ معاملہ دو آتشہ ہو گیا، کامیاب استاذ کا کمال ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن میں موضوع کی محبت بٹھائے۔
راقم کے ترمذی کے سلسلہ واری دروس برمنگھم، انگلینڈ کی مرکزی مسجد جس میں سامعین کی غالب اکثریت احناف کی ہوتی ہے، الہجرہ مسجد جن میں ملے جلے پس منظر کے لوگ شریک ہوتے ہیں، یوکے اسلامک مشن جماعت اسلامی کی مشہور مسجد میں ہفتہ واری سلسلہ جاری ہے، ہر مسجد کے نمازی اور ان کا پس منظر بھی مختلف ہے جس وقت ہم عمر آباد میں زیر تعلیم تھے، اس وقت تو یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ کبھی انگلستان کی مساجد اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ قرآن وسنت کی شمع روشن کرسکیں گے، اللہ عزوجل قبول فرمائے، اساتذہ اور جملہ معاونین ومنتظمین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ استاذ محترم حفیظ بھائی لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کی حقیقی محبت پیدا کرنے اور طرز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قریب لانے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ ان میں حدیث کی محبت بٹھائی جائے۔

مضمون حدیث کا مقدمہ آپ سے سیکھا اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ سفر پر روانہ ہوگئے، اور واپس اس وقت تشریف لائے جب ہم آخری سال کے آخری حصہ میں داخل ہو چکے تھے اور جامعہ میں پچاس سالہ تقریبات جشن طلائی کی گہما گہمی تھی، پھر کتاب ہم نے مشہور استاذ حدیث مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی رحمہ اللہ سے پڑھی۔

اس وقت حفیظ بھائی کے درس کی شان کچھ ایسی تھی کہ گویا علم کا دریا بہہ رہا ہے جو جتنا چاہے استفادہ کرلے، الفاظ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں جیسے چاہیں علم وادب کی لڑی میں پروتے چلے جائیں اور سحر بیانی کچھ ایسی کہ ایک سال ترجمہ وتفسیر قرآن کا مضمون آپ کے پاس مقرر تھا، جامعہ کی قدیم عمارت معہد القرآن کے درمیانی ہال میں کلاس ہوا کرتی، اس وقت کے مشہور قاری محترم حافظ عبید اللہ رحمہ اللہ شعبہ حفظ اور تجوید کے استاذ تھے، ان کا کمرہ ہال کے مغربی جانب تھا اور کلاس مشرقی جانب، انہیں اپنی کلاس کے لیے ہال سے ہی گزر کر جانا ہوتا، درمیان میں حفیظ بھائی کی ترجمہ وتفسیر کی کلاس جوبن پر ہوتی، محترم حافظ رحمہ اللہ عموماً پارٹیشن کے عقب میں ٹھہرے کافی دیر تک درس سنا کرتے، یہ کسی بھی صاحب ذوق کے لیے آسان نہیں ہوتا کہ علم وفکر کے اس بہتے دریا سے ویسے ہی خشک گذر جائے اور ہم طلبہ کی محویت کا عالم یہ ہوتا کہ کسی اہم واقعہ کی تفصیل جاری ہے کہ گھنٹی ختم ہوگئی ہم منہ بسور کر رہ جاتے کہ اتنی جلدی وقت ختم ہو گیا، حالانکہ طالب علمانہ زندگی میں طلبہ عموماً گھنٹی ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں، استاذ محترم کی کوشش ہوتی کہ طلبہ کو قرآن کے مفہوم اور روح واقعہ سے قریب تر کیا جائے، اس اسلوب کا راقم کو فراغت کے بعد کی میدانی زندگی میں بہت فائدہ ہوا، ان شاء اللہ یہ بھی اساتذہ کرام کے حسنات میں عند اللہ اضافہ کا سبب ہی بنے گا۔

استاذ محترم نے جامع ترمذی اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا تعارف کچھ اس انداز میں کروایا کہ ایک طویل عرصہ گذرنے کے باوجود کلاس میں کہے ہوئے کئی جملے ابھی تک یاد ہیں، گوکہ فراغت کے بعد مجھے مدینہ منورہ میں کلیۃ الحدیث میں ہی داخلہ کا شرف حاصل ہوا، حدیث سے وابستگی میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا گیا اور آج قرآن وحدیث کے کئی پروگرام مختلف ٹی وی چینلز اور مساجد میں الحمدللہ کامیابی سے جاری ہیں، استاذ محترم نے اپنی تمہیدی گفتگو میں طلبہ کو حدیث سے اتنا قریب کر دیا تھا اس موضوع کی اہمیت اور ائمہ حدیث کی عظمت دل میں گھر کر گئی خصوصاً سنن ترمذی سے تو محبت سی ہوگئی پھر اس پر اضافہ مولانا ظہیر الدین رحمانی رحمہ اللہ کے درس کا انداز دوران درس اپنے استاذ گرامی علامہ عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ تحفۃ الاحوذی کے حوالہ سے جب گفتگو کرتے تو گویا یہ معاملہ دو آتشہ ہو گیا، کامیاب استاذ کا کمال ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن میں موضوع کی محبت بٹھائے۔

راقم کے ترمذی کے سلسلہ واری دروس برمنگھم، انگلینڈ کی مرکزی مسجد جس میں سامعین کی غالب اکثریت احناف کی ہوتی ہے، الہجرہ مسجد جن میں ملے جلے پس منظر کے لوگ شریک ہوتے ہیں، یوکے اسلامک مشن جماعت اسلامی کی مشہور مسجد میں ہفتہ واری سلسلہ جاری ہے، ہر مسجد کے نمازی اور ان کا پس منظر بھی مختلف ہے جس وقت ہم عمر آباد میں زیر تعلیم تھے، اس وقت تو یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ کبھی انگلستان کی مساجد اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ قرآن وسنت کی شمع روشن کرسکیں گے، اللہ عزوجل قبول فرمائے، اساتذہ اور جملہ معاونین ومنتظمین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ استاذ محترم حفیظ بھائی لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کی حقیقی محبت پیدا کرنے اور طرز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قریب لانے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ ان میں حدیث کی محبت بٹھائی جائے، عموماً دیکھا گیا کہ لوگ روزمرہ کی زندگی میں حدیث کے مطابق عمل کرنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں، مختلف مسائل میں کوئی رہنمائی درکار ہو تو حدیث کی روشنی میں جواب تلاش کرتے ہیں یہ بھی میں نے تجربہ کیا کہ آپ اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے مختلف رجحانات رکھنے والوں کے ساتھ دینی تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں جس کی آج کل شدت سے ضرورت محسوس

کی جارہی ہے۔

جو کچھ تمہیدی کلاس میں فرمایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کے استاذ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ "لقد استنفدت منك أكثر ما استفدت مني" نیز اصول حدیث کا یہ قاعدہ کہ "رواية الأكابر عن الأصاغر" یعنی بڑے معزز علماء کی چھوٹے علماء سے روایت عموماً چھوٹے بڑوں سے لیتے ہیں، لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حدیث خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لی اور تحسین کی اور دوسری کی سماعت کی، یہ بات جہاں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی قدرومنزلت سمجھنے کے لیے اہمیت رکھتی ہے وہیں علماء کبار کی علم کے آگے کسر نفسی اور تواضع کا پتہ دیتی ہے بعض مشاہیر اہل علم وفن نے سنن ترمذی کی افادیت کو بخاری اور مسلم پر ترجیح دی ہے، اس لحاظ سے کہ بخاری اور مسلم کا مقام اور معیار اتنا اونچا ہے کہ عام طالب علم اس سے جلد استفادہ نہیں کرسکتا، جبکہ ترمذی کا اسلوب سہل اور واضح ہے یوں معمولی علمی پس منظر رکھنے والے بھی اس سے بھرپور استفادہ کرسکتے ہیں۔

ترمذی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ اس کا درجہ حدیث بھی بتادیتے ہیں جس سے حدیث کی استنادی حیثیت کا بھی پتہ چل جاتا ہے اگر چیکہ اس میں کہیں کہیں جھول بھی واقع ہوا ہے، ترمذی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے جو دراصل ان سطور کی تحریر کا محرک بناوہ یہ کہ حدیث ذکر کرنے کے بعد اس کے متعلق اہل علم کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے تو کیوں ؟! بلکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک کہا کہ میں نے اس کتاب میں وہی حدیث ذکر کی ہے جس کے مطابق مشہور علماء نے بھی اپنی رائے یا فتوی دیا ہو، پوری کتاب میں صرف دو حدیثوں کا ذکر کیا ہے کہ اس کے مطابق فتوی دینے والوں کا مجھے نام نہیں مل سکا، لیکن بعد میں آنے والوں نے اس کی بھی نشاندھی کردی، گویا امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کی حیثیت پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے مطابق عمل کرنے اور رائے دینے والے مشہور علماء کی بھی تلاش کی اور ایسی ہی احادیث اپنی کتاب میں درج فرمائی جن کے مطابق معروف علماء کرام نے بھی رائے دی اور عمل کیا ہو، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اہل علم کا کیا مقام ہے اور کتنی اہمیت ہے۔ اگر علمی امانت اور غایت درجہ خلوص نہ ہو تو اختلاف رائے رکھنے والوں کا تذکرہ آسان نہیں ہوتا، لیکن جگہ جگہ سنن ترمذی میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے اس سے ایک طرف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹ کر محبت بھی ثابت ہورہی ہے کہ سند کے لحاظ سے کسی حدیث کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ثابت ہوجائے تو سر اور آنکھوں پر ہونا چاہئے، لیکن میدان علم میں کمال کا دعوی نہیں کیا جاسکتا، اس کے سوا بھی رائے ہے اور مذکورہ حدیث سے مختلف رائے رکھنے والوں کے پاس اپنے دلائل ہیں۔

احادیث کا ذکر کرنے سے پہلے باب کا عنوان اس طرح باندھا گیا کہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو حدیث کی روشنی میں حل کرنے کی عملی شکل دکھائی دے سکے، گویا حدیث کو عملی زندگی سے قریب تر لانے کی سعی مشکور، یہ اسلوب وہی ہے جو صحیح بخاری میں پایا جاتا ہے، صرف احادیث صحیحہ کو ایک جگہ جمع کرنا نہیں بلکہ زندگی سے قریب تر کرنا اور براہ راست ان سے مسائل استنباط کرنا حتی کہ کہا گیا: "فقه البخاري في تراجمه" کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی دسترس اور کمال کو سمجھنے کے لیے کتاب میں مذکور ابواب کے عنوانات پر نظر ڈالنی کافی ہے۔

راقم کو تعجب ہوتا ہے ان بعض فارغین مدارس اور علماء پر جو سنن ترمذی جیسی کتاب پڑھنے کے باوجود جو تقریباً تمام مشہور دینی مدارس اور جامعات میں داخل نصاب ہے، علمی مسائل میں انتہاء پسندی اور ہٹ دھرمی پر اتر آتے ہیں، اور بعض محدثین اور فقہاء پر ایسے رکیک جملے کستے ہیں جیسے کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان کی کلاس کے ہمجولی اور ہم سبق تھے یا زیادہ سے زیادہ دو ایک درجے اونچے، ترمذی اور بدایۃ المجتہد درسگاہوں میں پڑھنے کے باوجود طبیعت میں اعتدال اور فکر ونظر میں توسع پیدا نہ ہو تو یہ بہت ہی غور طلب ہے، اساتذہ کے لیے بھی اور طلبہ کے لیے بھی۔

محدثانہ اسلوب کہ صحیح حدیث کو تاویلات اور حیلے بہانوں کے ذریعہ رد کرنے یا پیچھے کرنے کے بجائے اسے قبول کرنے کا جذبہ اور اختلافی رائے رکھنے والوں کو بھی اس کا حق دینے کی رواداری یہ محدثین اور فقہاء کا طرز ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیر اعلام النبلاء میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ یونس الصدفی فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اعلی ظرف کس کو نہیں دیکھا، میں نے ایک مرتبہ کسی مسئلہ میں ان کے ساتھ مناظرہ کیا، مجلس ختم ہوگئی، جب دوبارہ ہماری ملاقات ہوئی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھامے ہوئے کہا کہ اے ابو موسیٰ! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے درمیان اخوت اسلامی باقی رہے چاہے کسی مسئلہ کے متعلق ہم میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو، یعنی اختلاف رائے رکھنے کے باوجود اخوت اور مودت باقی رکھی جاسکتی ہے، ائمہ، خطباء اور علماء کرام کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

☆☆☆

محرم الحرام ہجری تقویم کا پہلا مہینہ ہے جس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کے واقعہ ہجرت پر ہے۔ گویا مسلمانوں کے نئے سال کی ابتداء محرم کے ساتھ ہوتی ہے۔ ماہِ محرم کے جو فضائل و مناقب صحیح احادیث سے ثابت ہیں، ان کی تفصیل آئندہ سطور میں رقم کی جائے گی اور اس کے ساتھ ان بدعات و خرافات سے بھی پردہ اُٹھایا جائے گا جنہیں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر دین حق کا حصہ بنانے کی مذموم کوششیں کی گئی ہیں۔

1۔ محرم، حرمت و تعظیم والا مہینہ ہے

قرآن مجید میں ہے کہ

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ﴾ (سورۃ التوبہ:36)

”اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں مہینوں کی گنتی بارہ ہے، اسی دن سے جب سے آسمان و زمین کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے چار مہینے ادب و احترام کے لائق ہیں، یہی درست دین ہے لہٰذا ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔“

یعنی ابتدائے آفرینش ہی سے اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے مقرر فرما رکھے ہیں۔ جن میں چار کو خصوصی ادب و احترام اور عزت و تکریم سے نوازا گیا۔ یہ چار مہینے کون سے ہیں، ان کی تفصیل صحیح بخاری و صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ ؓ سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”زمانہ اپنی اسی حالت پر واپس لوٹ آیا ہے کہ جس پر وہ اس وقت تھا جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی۔ سال کے 12 مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں، تین تو لگاتار ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا مضر قبیلے کا ماہِ رجب جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔“ (صحیح بخاری: 4662؛ صحیح مسلم:1679)

مذکورہ حدیث میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: ایک تو یہ کہ محرم بھی حرمت والے مہینوں میں شامل ہے اور دوسری یہ کہ زمانہ اپنی سابقہ حالت و ہیئت پر واپس لوٹ آیا ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی لوگ حرمت والے مہینوں کا احترام کرتے اور جنگ و جدل، قتل و غارت گری اور خون ریزی وغیرہ سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ اگر کبھی حرمت والے مہینے میں انہیں جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اپنے طور پر مہینوں کی تقدیم و تاخیر کر لیتے۔ اگر بالفرض محرم کا مہینہ ہے تو اسے صفر قرار دے لیتے اور (محرم میں اپنے مقصد پورے کرنے کے بعد) اگلے ماہ یعنی صفر کو محرم قرار دے کر لڑائی جھگڑے موقوف کر دیتے۔ قرآن مجید نے اس عمل کو نسیئ قرار دے کر زیادتِ کفر سے تعبیر فرمایا۔ (سورۃ التوبہ:37)

جس سال نبی اکرم ﷺ نے حج فرمایا، اس سال ذوالحجہ کا مہینہ قدرتی طور پر اپنی اصلی حالت پر تھا۔ اس لئے آپ نے مہینوں کے اُدل بدل کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ زمانہ گھوم گھما کر اپنی اصلی حالت پر واپس لوٹ آیا ہے۔ یعنی اب اس کے بعد مہینوں کی وہی ترتیب جاری رہے گی جسے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے جاری فرما رکھا ہے۔

دونوں باتوں کا حاصل یہی ہے کہ محرم ادب و احترام والا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ادب و احترام والا بنایا جبکہ اس کے آخری رسول ﷺ نے اس کی حرمت کو جاری رکھا اور عرب کے جاہل بھی اس کا اس قدر احترام کرتے کہ احترام کے منافی کسی عمل کے جواز کے لئے کم از کم اتنا حیلہ ضرور کر لیتے کہ فرضی طور پر حرمت والے مہینے کو کسی دوسرے غیر حرمت والے مہینے سے بدل لیتے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے یہ بات از خود سمجھ آجاتی ہے کہ ماہِ محرم کی حرمت و تعظیم کا حضرت حسین کے واقعہ شہادت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں جو اس مہینے کی حرمت کی کڑیاں واقعہ کربلا اور شہادتِ حسین ؓ سے ملاتے ہیں۔ اس لئے کہ ماہِ محرم کی حرمت تو اس دن سے قائم ہے جس دن سے یہ کائنات بنی ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی گذشتہ آیت: ﴿يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ...﴾ سے واضح ہے۔

علاوہ ازیں سانحہ کربلاء، قطع نظر اس سے کہ اس میں سیدنا حسین ؓ کی مظلومانہ شہادت ہوئی، کا دین اسلام سے اس معنی میں کوئی تعلق نہیں کہ اس میں دین کی حفاظت کا کوئی مسئلہ درپیش تھا بلکہ اوّل تو دین اسلام سیدنا حسین ؓ کے واقعہ شہادت سے کئی عشروں پہلے ہی نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں مکمل ہو چکا تھا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا﴾(سورۃ المائدۃ:2)

اور دوم یہ کہ دین کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اُٹھارکھاہے،جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَه لَحَافِظُوْنَ﴾

معلوم ہوا کہ یہ تصور جہالت ولاعلمی پر مبنی ہے کہ ماہِ محرم کا ادب و احترام شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کا مرہونِ منت سمجھا جائے بلکہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ سے پہلے اسی ماہ کی یکم تاریخ کو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے خلیفہ راشد کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آچکا تھا۔ مگر اس وقت سے آج تک کبھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت اس انداز سے پیش نہیں کیا گیا۔

حالانکہ اگر کسی بڑے آدمی کی موت یا شہادت کسی مہینے کے ادب و احترام کی علامت ہوتی تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے علمی، دینی، روحانی اور خلیفہ ثانی ہونے کے حوالے سے اس بات کے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی زیادہ مستحق ہوتے کہ ان کی شہادت پر وہ سب کچھ کیا جاتا جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کیا جاتا ہے۔ مزید بر آں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر و جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادتیں بدرجہ اولیٰ یہ استحقاق رکھتی ہیں مگر اہلِ سنت ان تمام شہادتوں پر نوحہ وماتم اور مجالس عزا وغیرہ کا اہتمام اس لئے نہیں کرتے کہ اسلام ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا اور جو ایسا کرتا ہے اس کا دین و ایمان خطرے میں ہے اور اسلام کا نوحہ وماتم سے کوئی تعلق نہیں۔

محرم کی بے حرمتی

ویسے تو جنگ وجدل، قتل وغارت گری، خونریزی اور فتنہ وفساد کی کسی بھی مہینے، ہفتے اور دن میں اجازت نہیں تاہم حرمت والے مہینوں میں فتنہ و فساد کی ہر ممکنہ شکل سے اجتناب کرنے کا تاکیدی حکم ہے۔ لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ماہِ محرم کی حرمت کو اتنا ہی پامال کرتے ہیں جتنا کہ اس کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی گئی۔

ماہ محرم کی حرمت کی پامالی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت پر نالہ وشیون اور نوحہ وماتم کیا جاتا ہے۔ اپنے جسم کو از خود سخت تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ تیز دھاری آلات سے جسم کو زخمی کیا جاتا ہے۔ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے رنج و غم میں آہ و بکا کا ایسا عجیب وحشیانہ اور خوفناک منظر برپا کیا جاتا ہے کہ الامان والحفیظ! اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی کی وفات یا شہادت پر رنج و غم اور افسوس کا اظہار نہ کیا جائے لیکن یہ اظہار شرعی حدود میں رہتے ہوئے ہونا چاہئے جبکہ نوحہ وماتم کرنے والے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ أَوْ شَقَّ الْجُيُوبَ أَوْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»

"وہ شخص ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں جس نے رخسار پیٹے، گریبان چاک کئے اور دورِ جاہلیت کے بین کئے۔" (صحیح بخاری:1297)

ماہِ محرم کی حرمت کی پامالی کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ آپس میں نہ صرف یہ کہ دست و گریبان ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہیں۔ تقریباً ہر سال ماہ محرم میں کسی نہ کسی 'مسجد' یا 'امام بارگاہ' میں معصوم لوگ دہشت گردی کی کارروائی کا شکار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ اسلام تو عام دنوں میں بھی خونریزی، دہشت گردی اور فتنہ وفساد کی کسی بھی شکل کو پسند نہیں کرتا پھر بھلا ماہِ محرم میں اسے کیسے پسند کر سکتا ہے؟ اس لئے اسلام سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی کسی بھی دہشت گردی کی کاروائی سے کلی اجتناب کیا جائے۔ ویسے بھی یہ بات ذہن نشین رہے کہ اگر کوئی شخص فی الواقع کفر وشرک اور ارتداد کا مرتکب ہو رہا ہو اور واقعی وہ قتل کی سزا کا مستحق ہو چکا ہو تو تب بھی ایسے شخص یا گروہ کو سزائے قتل دینے کی مجاز صرف حکومتِ وقت ہے۔ ہر کہ ومہ کو اسلام یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو نافذ کرنا شروع کر دے!

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض دفعہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں دشمن عناصر قوتوں کا ہاتھ ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں کے مسلکی و گروہی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی فرقے کے لوگوں کو تخریب کاری کا نشانہ بنا کر دوسرے فرقے پر اس کا الزام لگا دیتے ہیں۔ پھر دوسرا فرقہ تحقیق کئے بغیر محض جوشِ انتقام میں مخالف فرقے کو نشانہ بناتا ہے اور اس طرح تخریب کاری کا ایک غیر متناہی سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اس لئے امن و امان کے قیام کے لئے ہمیں ان تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کی نگاہ میں خونِ مسلم کی حرمت انتہائی اہم حیثیت رکھتی ہے۔

2۔ محرم کے روزوں کی فضیلت

رمضان المبارک کے روزے سال بھر کے دیگر تمام روزوں سے افضل ہیں۔ البتہ رمضان کے ماسوا محرم کے روزوں کی فضیلت سب سے بڑھ کر ہے جیسا کہ درج ذیل صحیح احادیث سے ثابت ہے:

1۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَفْضَلُ الصِّيَامِ، بَعْدَ رَمَضَانَ، شَهْرُ اللهِ الْمُحَرَّمُ، وَأَفْضَلُ الصَّلَاةِ، بَعْدَ الْفَرِيضَةِ، صَلَاةُ اللَّيْلِ» (صحیح مسلم:1163)

"رمضان المبارک کے بعد اللہ کے مہینے محرم کے روزے سب روزوں سے افضل ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز آدھی رات (یعنی تہجد) کے

وقت پڑھی جانے والی نماز ہے۔''

2۔ صحیح مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ

« أَيُّ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ بَعْدَ الْمَكْتُوبَةِ؟ وَأَيُّ الصِّيَامِ أَفْضَلُ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ؟ »

''فرض نمازوں کے بعد کون سی نماز سب سے افضل ہے اور رمضان المبارک کے بعد کون سے روزے سب سے افضل ہیں؟تو آپ نے وہی جواب دیا جو پہلی حدیث(مسلم:1163)میں مذکور ہے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ایک آدمی نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول!اگر رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں، میں روزے رکھنا چاہوں تو آپ کس مہینے کے روزے میرے لئے تجویز فرمائیں گے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں روزے رکھنا چاہے تو محرم کے مہینے میں روزے رکھنا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے۔اس میں ایک دن ایسا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول فرمائی اور ایک قوم کی توبہ (آئندہ بھی) قبول فرمائیں گے۔''(جامع ترمذی:741)

واضح رہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس روایت کو 'حسن' قرار دیاہے جبکہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن اسحٰق نامی راوی کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیاہے۔لہٰذا سنداً یہ روایت ضعیف ہے۔تاہم محرم کا 'شہر اللہ' ہونا اور اس کے روزوں کا رمضان کے سوا دیگر مہینوں کے روزوں سے افضل ہونا دیگر صحیح روایات سے ثابت ہے۔

3۔یوم عاشوراء کے روزے کی فضیلت

1۔سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وصيام يوم عاشوراء احتسب على الله أن يكفر السنة التي قبله»

''مجھے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ یوم عاشورا کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔''(صحیح مسلم:1162)

واضح رہے کہ 'عاشوراء' عشر سے ہے جس کا معنی ہے دس 10؛ اور محرم کی دسویں تاریخ کو عاشوراء کہا جاتا ہے۔البتہ مذکورہ فضیلت دسویں تاریخ کے روزے کی ہے یا نویں کی، اس میں اہل علم کا شروع سے اختلاف چلا آتا ہے۔مزید تفصیل آگے آرہی ہے...

2۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

''قریش کے لوگ دورِ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے اور نبی اکرم ﷺ بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔پھر جب آپ مدینہ تشریف لے آئے تو تب بھی عاشوراء کا روزہ رکھتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا آپ نے حکم دے رکھا تھا۔البتہ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کی فرضیت ختم ہوگئی۔لہٰذا اب جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''(صحیح بخاری:2003؛ صحیح مسلم:1125)

3۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دورِ جاہلیت میں لوگ یومِ عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمان بھی اس دن روزہ رکھتے۔ پھر جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن عاشوراً يوم من أيام الله فمن شاء صامه ومن شاء تركه" (صحیح مسلم:1162)

''عاشورا اللہ تعالیٰ کے دنوں میں سے ایک (معزز) دن ہے لہٰذا جو اس دن روزہ رکھنا چاہے، وہ روزہ رکھے اور جو نہ رکھنا چاہے وہ نہ رکھے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں قریش دسویں محرم کا روزہ کیوں رکھتے تھے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہر سال ماہِ محرم کی اس تاریخ کو بیت اللہ کو غلاف پہنایا کرتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے۔(صحیح بخاری:1582)لیکن اس پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریش غلافِ کعبہ کے لئے یہی دن کیوں خاص کرتے تھے؟تو اس کا جواب (اور پہلے سوال ہی کا دوسرا جواب) یہ ہوسکتا ہے جو سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''دورِ جاہلیت میں قریش نے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کیا جو ان پر بڑا گراں گزرا تو ان سے کہا گیا کہ تم لوگ عاشوراء کا روزہ رکھو یہ تمہارے گناہ کا کفارہ ہوجائے گا۔ پھر اس وقت سے قریش عاشوراء کا روزہ رکھنے لگے۔''(فتح الباری:4/773)

4۔سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

''جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔آپ نے ان سے پوچھا کہ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ ایک اچھا(افضل) دن ہے اور یہی وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن(فرعون) سے نجات بخشی(اور فرعون کو اس کے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرقاب کیا)تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے(بطورِ شکرانہ)اس دن روزہ رکھا (اور ہم بھی روزہ رکھتے ہیں) تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے (شریکِ مسرت ہونے میں) تم سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس دن روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔''(صحیح بخاری:2004؛ صحیح مسلم:1130)

5۔سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

''میں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ دنوں میں سے دسویں محرم (یوم عاشوراء) کے اور مہینوں میں سے ماہِ رمضان کے روزوں کے سوا کسی اور روزے کو افضل سمجھ کر اس کا اہتمام کرتے ہوں۔''

(صحیح بخاری:2006؛ صحیح مسلم:1132)

6۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "عاشوراء کے روز یہودی عید مناتے مگر نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس دن روزہ رکھا کرو۔" (صحیح بخاری: 2005؛ صحیح مسلم:1131)

7۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ "اہل خیبر عاشوراء کے روز، روزہ رکھتے اور اس دن عید مناتے اور اپنی عورتوں کو اچھے اچھے لباس اور زیورات پہناتے مگر اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم اس دن روزہ رکھو۔" (صحیح مسلم:2661)

8۔ سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قبیلہ بنواسلم کے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں جاکر یہ اعلان کرے کہ

"جس نے کچھ پی لیا ہے، وہ اب باقی دن کھانے پینے سے رکا رہے اور جس نے کچھ نہیں کھایا، وہ روزہ رکھے کیونکہ آج عاشوراء کا دن ہے۔" (صحیح بخاری: 2007؛ صحیح مسلم:1135)

9۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جب دسویں محرم کا روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ

"اے اللہ کے رسول ﷺ! اس دن کو یہود و نصاریٰ بڑی تعظیم و اہمیت دیتے ہیں۔ (یعنی ان کی مراد یہ تھی کہ آپ تو ہمیں یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم دیتے ہیں اور یوم عاشوراء کے معاملہ میں تو ان کی موافقت ہو رہی ہے۔) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"فإذا كان العام المقبل إن شاء الله صمنا اليوم التاسع"

"آئندہ سال اگر اللہ نے چاہا تو ہم نویں تاریخ کو روزہ رکھیں گے۔" سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگلا سال آنے سے پہلے اللہ کے رسول انتقال فرماگئے۔" (صحیح مسلم:1134)

10۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے لفظ یہ ہیں کہ

"لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع"

"اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو ضرور نو کا روزہ رکھوں گا۔" (صحیح مسلم)

روزہ نو محرم کو یا دس کو؟

عاشوراء کے روزے کے بارے میں اہل علم کا شروع سے اختلاف چلا آتا ہے کہ یہ روزہ نو تاریخ کو رکھا جائے یا دس کو؛ یا نو اور دس دونوں کے روزے رکھے جائیں؟ وجہِ اختلاف صحیح مسلم کی مندرجہ بالا حدیث (نمبر ۹) ہے جس میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"آئندہ سال میں زندہ رہا تو نو تاریخ کا روزہ رکھوں گا۔"

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اگرچہ نبی کری ﷺ کو عملی طور پر نو کا روزہ رکھنے کا موقع نصیب نہ ہوسکا تاہم آپ کا یہ فرمان دسویں محرم کے روزے کے لئے بطورِ ناسخ ہے اور اب صرف اور صرف نو ہی کا روزہ رکھنا چاہیئے۔ جبکہ بعض اہل علم اس کے برعکس اس موقف کے حامل ہیں کہ نو اور دس دونوں کا روزہ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اصل فضیلت والا دن تو دسویں محرم کا ہے۔ جبکہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرتے ہوئے اس کے ساتھ نویں محرم کا روزہ بھی شامل ہوجائے گا اور اس طرح دونوں صورتوں یعنی فضیلتِ عاشوراء اور مخالفتِ یہود و نصاریٰ پر عمل ہوجائے گا۔ لہٰذا 9 اور 10 دونوں تاریخوں کے روزے از بس فضیلت کے لئے ضروری ہیں۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ میں وسعت پائی جاتی ہے، اس لئے مندرجہ دونوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے ساتھ ہی اسے خاص کردینا اور اس کے برعکس دوسری کو غلط قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں کے الگ الگ مضبوط دلائل موجود ہیں، مثلاً:

صرف نو کا روزہ رکھنے کی دلیل صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے کہ آئندہ سال میں زندہ رہا تو نو کا روزہ رکھوں گا۔ اب حدیث کے ظاہری الفاظ کا یہی تقاضا ہے کہ نو ہی کا روزہ رکھا جائے باقی رہی یہ بات کہ اصل فضیلت تو دسویں محرم کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فضیلت کا معیار شریعت ہے۔ اگر شریعت دس کی بجائے نو کو باعثِ فضیلت قرار دے دے تو پھر نو ہی کی فضیلت سمجھی جائے گی اور یہی وجہ ہے کہ جب حکم بن اعرج نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یومِ عاشوراء کے روزے کا سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

"جب محرم کا چاند دیکھ لو تو دن گننا شروع کردو اور نویں تاریخ کو روزہ کے ساتھ صبح کرو۔"

سائل نے پوچھا: "کیا اللہ کے رسول اسی دن روزہ رکھتے تھے؟" تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: ہاں!" (صحیح مسلم:1133)

اگرچہ نبی کریم ﷺ دسویں محرم کو روزہ رکھتے رہے مگر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نویں محرم کے روزے کی نسبت اللہ کے رسول کی طرف اس لئے کردی کہ نبی کریم ﷺ یہ فرماچکے تھے کہ آئندہ سال میں 9 کا روزہ رکھوں گا۔ گویا اب نویں کو ہی کو سنت سمجھا جائے گا، اگرچہ عملی طور پر حضور کو یہ موقع نہیں مل سکا کہ آپ 9 کا روزہ رکھتے۔

10 کا روزہ رکھنے والوں کی پہلی دلیل تو یہی ہے کہ اصل فضیلت والا دن 10 محرم ہے اور اسی دن نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزہ رکھتے رہے۔ تاہم اللہ کے رسول کا یہ فرمان کہ آئندہ سال میں 9 کا روزہ رکھوں گا، اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ میں 10 کا روزہ چھوڑ دوں گا۔ بلکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھوں گا تاکہ یہود

ونصاریٰ کی بھی مخالفت ہوسکے۔

اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

«صوموا التاسع والعاشر وخالفوا اليهود» (السنن الکبریٰ للبیہقی:4/278)

"9 اور 10 (دونوں کا) روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔"

شیخ احمد عبدالرحمن البناء رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقوف روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (الفتح الربانی: 1/189؛ مصنف عبدالرزاق:7839؛ طحاوی:2/78)

اس سلسلے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث بھی ذکر کی جاتی ہے کہ

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"لئن بقيت لآمرن بصيام يوم قبله أو يوم بعد يوم عاشوراء"

"اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو میں یہ حکم ضرور دوں گا کہ دسویں محرم سے پہلے یا اس کے بعد (یعنی گیارہویں محرم) کا ایک روزہ (مزید) رکھو۔"

یہ روایت مسند حمیدی (485) اور سنن کبریٰ از بیہقی (4/287) میں موجود ہے مگر اس کی سند میں ابن ابی لیلیٰ (جن کا نام محمد بن عبدالرحمن ہے) ضعیف راوی ہے۔ جبکہ امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت 'الکامل' (3/956) میں درج کی ہے اور اس کی سند میں داود بن علی نامی راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ایک تیسری صورت

بعض اہل علم مندرجہ بالا اختلاف سے بچتے ہوئے ایک تیسری صورت یہ پیش کرتے ہیں کہ 9، 10 اور گیارہ تینوں تاریخوں کے پے در پے روزے رکھ لئے جائیں۔

بطورِ دلیل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«صوموا يوم عاشوراء وخالفوا فيه اليهود وصوموا قبله يوما أو بعده يوما»

"یومِ عاشوراء کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ (اس مخالفت کا طریقہ یہ ہے کہ) یوم عاشوراء (دس محرم) کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھو۔" یہ روایت مسند احمد (1/241)؛ ابن خزیمہ (2095)، الکامل (3/956)، السنن الکبریٰ للبیہقی (4/287) وغیرہ میں موجود ہے مگر اس کی سند میں بھی ابن ابی لیلیٰ اور داود بن علی نامی دو راوی ضعیف ہیں لہٰذا یہ قابل حجت نہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ روایت میں 'أو' (قبله يوما 'أو' بعده يوما) بمعنیٰ 'یا' ہے۔ جبکہ بعض طرق میں یہاں 'و' بمعنیٰ 'اور' ہے۔ جس کے پیش نظر بعض اہل علم نے تین دن (9، 10، 11) کے روزے رکھنے کا رجحان ظاہر کیا ہے۔ (فتح الباری:4/773) مگر محل استشہاد روایت ہی ضعیف ہے، اس لئے یہ موقف کمزور ہے۔

احتیاط کا تقاضا

مذکورہ اختلافی مسئلہ میں اگر احتیاط کا پہلو مد نظر رکھا جائے تو پھر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ 9 اور 10 دونوں کا روزہ رکھا جائے کیونکہ اگر شریعت کی منشا 9 اور 10 دونوں کا روزہ رکھنے میں ہوئی تو اس پر عمل ہوجائے گا اور اگر 9 کا روزہ رکھنے میں ہوئی تو تب بھی 9 کا روزہ رکھا جائے گا اور 10 کا روزہ اضافی نیکی قرار پائے گا۔ علاوہ ازیں اس طرح یوم عاشوراء کی فضیلت اور یہود و نصاریٰ کی مخالفت دونوں ہی پر عمل بھی ہوجائے گا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ

"وقال بعض أهل العلم: قوله في صحيح مسلم لئن عشت إلى قابل لأصومن التاسع، يحتمل أمرين أحدهما أنه أراد نقل العاشر إلى التاسع والثاني أراد أن يضيفه إليه في الصوم فلما توفي اقبل بيان ذلك كان الاحتياط صوم اليومين" (فتح الباری: ایضاً)

"بعض اہل علم کے بقول صحیح مسلم میں مروی اس حدیث نبوی کہ "اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو نو کا ضرور روزہ رکھوں گا۔" کے 2 مفہوم ہوسکتے ہیں: ایک تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ یوم عاشوراء کے روزہ کے لئے دس کی بجائے نو کا روزہ مقرر کردیا جائے اور دوسرا یہ کہ آپ 10 کے ساتھ 9 کا روزہ بھی مقرر فرمانا چاہتے تھے۔ (اب اگر نبی کریم ﷺ اس کے بعد اگلے محرم تک زندہ رہتے تو آپ کے عمل سے مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ایک صورت ضرور متعین ہوجاتی) مگر آپ کسی صورت کو متعین کرنے سے پہلے وفات پاگئے تھے، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ 9 اور 10 دونوں کا روزہ رکھا جائے۔"

واضح رہے کہ بغرضِ احتیاط 9 اور 10 دونوں کا روزہ رکھنے کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ صرف 9 کا روزہ رکھنے والوں کے خلاف فتویٰ بازی کی جائے بلکہ صرف 9 کے روزہ کی گنجائش بھی بہرحال موجود ہے۔ (واللہ اعلم)

محرم میں روزوں کے منافی اُمور

گذشتہ احادیث سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ماہِ محرم میں روزے رکھنا مسنون اور افضل ترین عمل ہے حتیٰ کہ رمضان المبارک کے بعد ماہِ محرم کے روزوں کو سب سے افضل قرار دیا گیا ہے اور محرم میں بھی نویں اور دسویں کا روزہ دیگر دنوں کے روزوں سے افضل ہے، لیکن افسوس کہ جیسے ہی محرم کا مہینہ شروع ہوتا ہے، روزوں کے منافی اُمور کا سلسلہ بھی

شروع ہو جاتا ہے۔ شہادتِ حسین کی یاد میں دودھ، پانی یا مشروبات کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں، دیگیں پکا کر لوگوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے، خوش ذائقہ ماکولات و مشروبات کا اہتمام کرکے فاتحہ خوانی کی محفلیں قائم کی جاتی ہیں اور جوں جوں دسویں محرم کا دن قریب آتا ہے، توں توں ان امور کے دائرہ میں وسعت اور تیزی آتی چلی جاتی ہے۔ گویا محرم اور یوم عاشوراء کے موقع پر نبی کریم ﷺ جتنا اہتمام روزے کا فرمایا کرتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی ترغیب دلاتے، دورِ حاضر کے مسلمان ماہِ محرم میں اتنا ہی اس کے منافی دعوتوں اور ضیافتوں کا اہتمام کرنے لگے ہیں اور پھر اسے یقینی بنانے اور مسلسل قائم رکھنے کے لئے سرکاری طور پر ملک بھر میں چھٹی بھی منائی جاتی ہے۔

چنانچہ ایک طرف تو بعض لوگ مذکورہ اُمور کی شرعی حیثیت کی چھان پھٹک کئے بغیر ہر اس رسم، رواج اور طریقے کی اتباع شروع کر دیتے ہیں جسے کسی قوم، قبیلے یا فرقے میں خاصا مقام اور شہرت حاصل ہو جبکہ دوسری طرف بعض لوگ مذکورہ اُمور کے ثبوت کے لئے شرعی و عقلی دلائل بھی پیش کرنے لگتے ہیں مثلاً یہ کہ

1۔ یزید کے لشکروں نے شہدائے کربلاء کا پانی بند کر دیا تھا، اس لئے شہدائے کربلاء سے اظہارِ محبت کے لئے ضروری ہے کہ ان کے نام پر پانی ہی نہیں بلکہ اچھے اچھے مشروبات کی بھی سبیلیں لگائی جائیں۔

2۔ شہدائے کربلاء کی اَرواح کے ایصالِ ثواب کے لئے ماکولات و مشروبات کا اہتمام کرکے فاتحہ خوانی کی محفلیں قائم کرنی چاہئیں۔

3۔ یہ (من گھڑت) روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ "جس شخص نے عاشوراء کے روز اپنے اہل و عیال (کے رزق کے معاملہ) پر فراخی وکشادگی کی، اللہ تعالیٰ سال بھر اس پر کشادگی فرماتے رہیں گے۔"

اگر قرآن وسنت کی تعلیمات کا غیر جانبدرانہ جائزہ لیا جائے تو مذکورہ اُمور کے جواز کی نہ کوئی گنجائش ملے گی اور نہ ہی کوئی معقول وجہ...!

1۔ اوّل تو اس لئے کہ ماہِ محرم میں روزے رکھنا مسنون ہے جبکہ ماکولات و مشروبات کے اہتمام سے نہ صرف روزوں کی مسنون حیثیت مجروح ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک بدعت بھی رواج پاتی ہے۔

2۔ دوم اس لئے کہ شہدائے کربلاء یا دیگر فوت شدگان کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ خوانی کی یہ صورتیں قرآن وسنت اور عمل صحابہ سے ثابت ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان صورتوں کو دین کا حصہ اور اجر وثواب کا ذریعہ سمجھ کر قائم کرنا بدعت نہیں تو پھر کیا ہے؟

3۔ رہی یہ بات کہ شہدائے کربلاء کا پانی بند کیا گیا تھا تو یہ قصہ ہی جھوٹا اور بے سند ہے جبکہ خود شیعہ ہی کی بعض کتابوں سے اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو جب قافلے کے لئے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ زمین کھودتے اور فوراً میٹھے پانی کا چشمہ بہہ نکلتا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: جلاء العیون باب 5 ص459، ناسخ التواریخ: 2/326، تصویر کربلا از سید آلِ محمد: ص31)

اگر بالفرض بندشِ آب کے قصہ کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر چاہئے تو یہ تھا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے اظہارِ محبت کے لئے ماہ محرم میں اتنے دن پیاسا رہنے کا مظاہرہ کیا جاتا جتنے دن ان سے پانی روکے رکھا گیا تھا!

4۔ ماکولات و مشروبات کے خصوصی اہتمام کی جو روایت بطورِ دلیل پیش کی جاتی ہے وہ محدثین کے ہاں بالاتفاق جھوٹی (موضوع) روایت ہے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"عاشوراء کے روز فضائل کے سلسلہ میں اہل و عیال پر فراخی وکشادگی اور مصافحہ وخضاب وغسل کی برکت وغیرہ کے متعلق جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس دن ایک خاص نماز پڑھنی چاہئے... یہ سب رسول اللہ ﷺ پر کذب و افتراء ہے۔ محرم میں عاشوراء کے روزے کے سوا کوئی عمل پسند صحیح ثابت نہیں۔" (منہاج السنۃ:4/11)

مذکورہ مسئلہ کی مزید تفصیل اور من گھڑت روایات کی تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو الموضوعات لابن جوزی (2/203)، اللآئی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ (2/94) الموضوعات الکبریٰ (ص341) اور مجموع الفتاویٰ (2/354)

5۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سانحۂ کربلاء کے رنج و غم میں رافضی وغیرہ اس انتہاء کو پہنچ گئے کہ نوحہ وماتم سے دور جہالت کی ان قبیح رسومات کو زندہ کرنے لگے کہ

جن سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے۔ جبکہ ناصبی اور خارجی قسم کے لوگ رافضیوں کی عداوت میں سانحۂ کربلاء پر خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ایام میں ماکولات و مشروبات کا انتظام کرنے لگے۔ پھر ایصالِ ثواب اور سوگ کے نام پر یہ دونوں باتیں دیگر مسلمانوں میں بھی بڑی تیزی سے سرایت کر گئیں۔

حالانکہ راہِ اعتدال یہی ہے کہ

ان تمام بدعات وخرافات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے واقعہ کربلاء کو مسلمانوں کے لئے عظیم سانحہ اور حادثہ فاجعہ قرار دیا جائے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے سیاسی اختلافات اللہ کے سپرد کرکے دونوں کے بارے میں خاموشی کی راہ اختیار کی جائے۔

☆☆☆

ہر طرح کی حمد و ثنا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، جو علم اور خبر رکھنے والا ہے، وہ آپ کے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور آپ کے رازوں سے بھی واقف ہے، جو تم ظاہر کرتے ہو، اس پر بھی نظر رکھتا ہے اور جو چھپاتے ہو، اس پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

﴿وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ﴾ (سورۃ الأنعام: 2)"وہی ایک اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔"

﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (سورۃ الأنعام:59)

"اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے"

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، وہ رازوں کو بھی جانتا ہے اور اس سے بھی زیادہ پوشیدہ چیزوں سے واقف ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی اس سے چھپی نہیں ہے۔

﴿إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (سورۃ طٰہٰ:98)

"لوگو، تمہارا اللہ تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے، ہر چیز پر اُس کا علم حاوی ہے"

میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے نبی ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالی نے آپ کو مخاطب کرتے فرمایا:﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾

"آپ کو وہ کچھ بتایا ہے جو آپ کو معلوم نہ تھا اور اس کا فضل آپ پر بہت عظیم ہے۔"(سورۃ النساء:113)

اللہ کی رحمتیں اور بہت سلامتیاں ہوں آپ ﷺ پر، آپ ﷺ کی آل پر اور آپ ﷺ کے پیروکاروں پر۔

بعد ازاں! اے حجاج بیت اللہ! اے ہر جگہ رہنے والے مسلمانو!

پرہیز گاری اختیار کرو، اللہ سے ڈروگے تو دنیا و آخرت کی کامیاب سعادت کمالوگے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوْاْ لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُواْ يَعْلَمُونَ﴾(البقرۃ:103)

"اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا، وہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا، کاش اُنہیں خبر ہوتی۔"اسی طرح فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (سورۃ البقرۃ:194)

"البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ انہیں لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

اسی طرح فرمایا:﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (سورۃ البقرۃ:231)

"اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔"

ہم بھلا اللہ سے کیوں نہ ڈریں، اخلاص کے ساتھ صرف اسی کی عبادت کیوں نہ کریں، جب کہ نفع ونقصان کا مالک وہی ہے، اس کا فرمان ہے:

﴿وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (سورۃ یونس:108)

"اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے تقوی کو تعلیم کے ساتھ ملاتے ہوئے فرمایا:﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (سورۃ البقرۃ:282)

"اللہ کے غضب سے بچو وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے"

پرہیز گاری کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس توحید کی طرف نے بلایا ہے، ہم اسے اپنالیں، صرف اسی کی عبادت کریں، عبادت کی کسی بھی شکل کو کسی اور کے لئے ادا نہ کریں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اللہ کا فرمان ہے:﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ * الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ البقرۃ:21-22)

"لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق

ہے، تمہارے بچنے کی توقع اِسی صورت ہو سکتی ہے * وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔"

تمام انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی چیز کی دعوت دی تھی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ العنکبوت:16)

"اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔"

اللہ تعالی نے آسمان سے کتابیں نازل کیں، رسولوں اور نبیوں کو بھی بھیجا، تاکہ وہ اپنی قوموں کو تعلیم دیں اور توحید کی تلقین کریں اور صرف اللہ تبارک و تعالی کی عبادت کرنے کا کہیں۔ اسی لئے ہر نبی اپنی قوم کو یہی کہتا تھا کہ:

﴿اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾ (سورۃ الأعراف:65)

"اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کروگے؟"

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ توحید کے ساتھ صرف اللہ تبارک و تعالی کی عبادت کرنا ہی لا الہ الا اللہ کا حقیقی تقاضا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ * وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا ۚ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ * وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾

"اللہ کا فرمان ہے کہ دو الہ نہ بنالو، الہ تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو * اُسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور خالصاً اُسی کا دین چل رہا ہے پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کروگے؟ * تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اُسی کی طرف دوڑتے ہو مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتا ہے تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے اچھا، مزے کرلو، عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا۔" (سورۃ النحل:51-53)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کے توحید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور نبی کریم ﷺ کی فرماں برداری کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کی خوشنودی کا طریقہ اور آخرت کی کامیابی کا راستہ ہے۔

نبی ﷺ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی باتوں کو سچ تسلیم کیا جائے، آپ ﷺ کے احکام کو مانا جائے اور اللہ تبارک و تعالی کی عبادت اسی طریقے کے مطابق کی جائے جو آپ ﷺ لائے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا * وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا﴾ (سورۃ الأحزاب:56-46)

"اے نبی (ﷺ)، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر * اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔"

کلمہ شہادت اسلام کا پہلا رکن ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «بُنِيَ الإسلامُ على خمسٍ شَهادةِ أن لا إلَهَ إلّا اللَّهُ وأنَّ محمَّدًا رسولُ اللَّهِ وإقامِ الصَّلاةِ وإيتاءِ الزَّكاةِ وصَومِ رمضانَ وحجِّ البيتِ منِ استطاعَ إليهِ سبيلًا» (صحیح بخاری:8)

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس گواہی پر کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، نماز ادا کرنے، زکوۃ دینے، روزہ رکھنے اور جس کے لئے ممکن ہو حج بیت اللہ کرنے پر۔"

اسلام کا دوسرا رکن نماز قائم کرنا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ﴾ (سورۃ العنکبوت:45)

"نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔"

زکوۃ کو قرآن کریم میں نماز کے ساتھ ہی ملایا گیا ہے۔ یہ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالدار لوگ اپنے مال کا کچھ حصہ ان لوگوں کو دے دیں جنہیں زکوۃ لینے کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس سے معاشرتی بھائی چارے کا حسین منظر نظر آتا ہے اور مفادِ عامہ کے لیے قربانی کا جذبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

اسلام کا ایک رکن رمضان کے روزے رکھنا بھی ہے اور آخری رکن حج بیت اللہ ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (سورۃ آل عمران:97)

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے"

اے حجاج کرام! اللہ تعالی نے آپ پر بہت احسان فرمایا ہے، آپ کے لیے یہاں پہنچنا اور حج میں شریک ہونا آسان کر دیا ہے، تو اپنے حج کو نبی کریم ﷺ کی ہدایات کے عین مطابق ادا کرو۔ نبی ﷺ نے فرمایا تھا: «خذوا عنّي مناسككم» (صحیح مسلم: 1297) "مجھ سے مناسک حج سیکھ لو"

اللہ تعالی کا فرمان ہے:﴿الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾

"حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اُسے خبر دار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بد عملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہو گا سفرِ حج کے لیے زاد راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔" (سورۃ البقرۃ:197)

نبی کریم ﷺ نے دین کے مراتب بھی بیان کیے۔ پہلا مرتبہ احسان کا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

ایمان کے ارکان یہ ہیں کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھو۔

تو اے حجاج بیت اللہ! اے ہر جگہ رہنے والے مسلمانو! میں اپنے آپ کو اور آپ سب کو کو اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں، کیونکہ یہی بہترین زاد راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (سورۃ آل عمران:133)

"دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی"

اللہ کے بندو! ذہن نشین کر لو کہ اسلام کی اقدار کو اپنانا بھی نیکی میں مقابلہ کرنے کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ انہیں اپنانے سے ہی مسلمانوں کا رویہ درست ہوتا ہے اور انہی کی بدولت وہ محفوظ رہتے ہیں۔ انہیں اپنانے کی بدولت ہی نبی ﷺ اس مقام و مرتبے تک پہنچے تھے، جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورۃ القلم:4)

"اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إنَّ مِن أحبِّكُم إليَّ، وأقربِكُم منِّي مَجلسًا يومَ القيامةِ، أحاسنُكُم أخلاقًا» (جامع ترمذی:2018)

"تم میں سے مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور وہی قیامت کے دن مجھ سے سب سے قریب ہوں گے جو سب سے اچھے اخلاق والے ہیں۔"

آسان الفاظ میں یہ ہے کہ اچھے اخلاق والے لوگوں کا وہ مشترکہ رویہ ہے، جس کی قدر ہر انسان کرتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا نہ ہو، کیونکہ یہ قول و عمل میں بہترین رویہ اپنانے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (سورۃ البقرۃ:83)

"لوگوں سے بھلی بات کہنا"

اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾

"اے نبی (ﷺ)، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔" (سورۃ فصلت:34)

بدسلوکی اور غلط رویوں کا مقابلہ کرنے میں صحیح طریقے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (سورۃ الأعراف:199)

"اے نبی (ﷺ)، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو۔"

اسی طرح فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ﴾

"پس (اے نبی (ﷺ)) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔" (سورۃ الروم:60)

یعنی اس بات سے چوکنے رہئے کہ کہیں یہ لوگ آپ کو خواہ مخواہ کی بحث مباحثے اور اس کے سنگین نتائج کا شکار نہ کر دیں۔

مسلمان اسلام کی مضبوط اقدار کی بنیاد پر ہی ایسی مضبوط شخصیت کا مالک بنتا ہے جو نہ جاہلوں کے منہ لگتا ہے، نہ برے مقاصد والوں کے ساتھ ملتا ہے اور نہ ہی رکاوٹوں سے ڈرتا ہے، بلکہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس فرمان کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے:

﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾ (القصص:55)

"اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔"

اسی طرح مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث کرنے یا ان کا جواب دینے سے بھی انہیں شہرت ملتی ہے، ان کے منصوبے کامیاب ہوتے ہیں اور انہیں خوشی ملتی ہے۔ بہت سے لوگ تو ردِ عمل کی بنیاد پر ہی مشہور ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کے فریب سے پردہ اٹھانا چاہیے، زیادتیوں کا راستہ روکنا چاہیے اور یہ ساری چیزیں اسلامی حکمت عملی کے مطابق ہونی چاہییں۔

اے بیت اللہ کے حاجیو! اے مسلمانو! اسلام کی اقدار میں یہ بھی شامل ہے کہ ایسی تمام چیزوں سے بچا جائے جن سے معاشرے میں نفرت، عداوت اور تفرقہ پھیلتا ہو۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں محبت اور بھائی چارہ پھیل جائے اور یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾

"سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔" (سورۃ آل عمران:103)

وحدت، اخوت اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت امتِ مسلمہ تمام طرح کی مشکلات سے بچ سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام اس چیز کا بھی داعی ہے کہ سب کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کیا جائے چاہے انسان ان کے

سامنے کسی طرح کا شخص بھی کیوں نہ ہو۔ اسلام ہی اجتماعیت کی روح ہے، جو ساری انسانیت کو اپنے اندر سمولیتی ہے۔ رسول اسلام صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا بھی فرمان ہے: «خيرُ الناسِ أنفعُهم للناسِ» (صحیح الجامع: 3289)"لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جو ان کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو۔"

اسلامی شریعت ایسے انسانی حقوق کو لے کر پروان چڑھی کہ جن میں دوہرے معیار نہیں ہیں اور جن کی بنیادیں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتیں، اسلام نے سب کے لیے خیر اور بھلائی کو پسند کیا ہے اور لوگوں کے دلوں کو آپس میں جوڑا ہے۔

ایسی اقدار کی بدولت اسلام کا نور ساری دنیا میں پھیلا ہے، اسے تاریخ کے ہر دور میں تبلیغ کے لیے ایسے لوگ میسر رہے جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہدایت یافتہ پیروکار سامنے آئے، جنہوں نے اسلام کے راستے کو اپنا لیا۔ اسی طرح راسخ اہلِ علم کا بھی تبلیغ اسلام میں بہت بڑا کردار رہا۔ انہوں نے تفہیم و تشریح کی ذمہ داری کو خوب نبھایا، غلط نظریوں اور غیر صحیح افکار کا مقابلہ کیا۔

اے حجاج بیت اللہ! قبولیت کی ایک گھڑی وہ بھی ہے کہ جس میں تم اس وقت ہو۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عرفات میں خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد اللہ تبارک وتعالی سے دعا مانگنے اور ذکر کرنے کے لئے لیے یہاں رک گئے تھے۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ظہر اور عصر کی نمازوں کو جمع اور قصر کے ساتھ، ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کیا، پھر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غروب آفتاب تک یہیں ٹھہرے۔ پھر پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ مزدلفہ کی طرف روانہ ہوگئے اپنے صحابہ کو بھی سکون و اطمینان کی تلقین کرتے رہے۔ مزدلفہ پہنچ کر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے مغرب کی تین رکعتیں اور عشاء کی دو رکعتیں ادا کیں۔ رات وہیں گزاری اور فجر بھی وہی ادا کی، پھر روشنی پھیلنے تک وہیں پر اللہ کے ذکر میں مصروف رہے۔ اس کے بعد آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے منیٰ کا رخ کیا اور وہاں جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں ماریں۔ پھر اپنے جانور قربان کیے، اپنے بال منڈوا کر جزوی طور پر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے، پھر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے مکہ جا کر طواف کیا اور پھر منیٰ واپس آگئے۔ ایام تشریق کی راتیں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے منیٰ میں ہی گزاریں۔ منیٰ میں بھی آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کثرت سے اللہ کو یاد کرتے رہے۔ روزانہ تینوں جمرات پر کنکریاں مارتے رہے۔ چھوٹے اور درمیانی جمرے پر سات سات کنکریاں مارتے، ان دونوں کو کنکریاں مارنے کے بعد کچھ دیر ٹھہر کر اللہ سے دعا کرتے اور پھر جمرۃ العقبہ پر بھی سات کنکریاں مارتے۔

اہل عذر کو نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے منیٰ میں نہ ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تیرہویں دن تک منیٰ میں رہے مگر لوگوں کو بارہویں دن منیٰ سے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ پھر سفر پر روانہ ہونے سے پہلے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے طواف وداع کیا۔

تو اے مسلمانو! اس عظیم موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ عرفات کے دن سے فائدہ اٹھاؤ کہ جس کے بارے میں اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (سورة المائدة: 3)"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

اور جس کے متعلق نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

«مَا مِن يومٍ أَكْثَرُ أن يُعْتِقَ اللَّهُ فيهِ عبدًا منَ النّارِ من يوم عرفةَ، وأنَّهُ ليَدعو، ثمَّ يباهي الملائِكَةَ» (صحیح مسلم:1348)

"جہنم سے آزادی کی سب سے زیادہ امید اسی دن، یعنی عرفات کے دن سے ہی لگائی جاسکتی ہے۔ اس دن اللہ تبارک و تعالی اہل موقف سے قریب آ جاتا ہے اور اپنے فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے۔"

تو اس دن میں کثرت سے دعائیں مانگو، کیونکہ اللہ تبارک و تعالی نے قبولیت کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

"تمہارا رب کہتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔"(سورۃ غافر:60)

اسی طرح فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة:186)

" اور اے نبی (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو اُنہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں۔"

اے اللہ! حجاج کرام سے مناسک حج کی ادائیگی قبول فرما۔ ان کی دعاؤں کو بھی اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرما۔ ان کے معاملات آسان فرما۔ ان کے گناہوں کو بخش دے۔ انہیں سلامتی اور اجر کے ساتھ اپنے گھروں تک لوٹا دے۔ یہ جب اپنے گھروں میں پہنچیں تو ان کے درجات بلند ہو چکے ہوں، ان کے مقام اونچے ہو چکے ہوں۔

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرة:201)

" اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا"

اے اللہ! اللہ مسلمانوں کے احوال درست فرما۔ انہیں اتحاد و اتفاق نصیب فرما۔ ان میں علم اور بھلائی کو عام کر دے۔ ان کی نسلوں کو نیک بنا۔ انہیں ان کے رزق میں برکت عطا فرما۔ انہیں جنت عطا فرما۔

اے اللہ! خادم حرمین، شاہ سلمان بن عبد العزیز اور ان کے ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کو کامیاب فرما، انہیں درست راستہ دکھا، ان کی مدد فرما، انہیں اور ان کی حکومت کو اسلام اور مسلمانوں اور ساری انسانیت کی خدمات پر جزائے خیر عطا فرما۔ ان کا ساتھی بن جا، ان کی تائید فرما، ان کی نصرت فرما۔

وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم

سیکولرزم (Secularism) کا اُردو معنیٰ 'لادینیت' ہے۔ سیکولرزم 'ایسی دُنیویت کو بھی کہتے ہیں جس کا آخرت یا دین سے کوئی تعلق نہ ہو'۔ سیکولر انسان 'وہ ہوتا ہے جو مذہبی نہ ہو'۔ سیکولر نظریہ 'وہ ہے جو دین یا مذہبی پیشوائیت کا پیش کردہ نہ ہو۔'

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق:

"سیکولرزم ایک اجتماعی تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کو آخرت کی توجہ سے یکسر ہٹا کر فقط دنیا کی طرف متوجہ کرنا ہے۔"

امریکی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

"سیکولرزم ایک ایسا اخلاقی نظام ہے جو آسمانی ادیان سے ہٹ کر اپنے اُصول وقواعد رکھتا ہے۔"

سیکولرزم کا ایک معنی ہے:

فَصْلُ الدِّيْنِ عَنِ الدَّوْلَةِ اَوِ الْمُجْتَمِع

دین کو معاشرہ یا ریاست سے جدا کرنا

معاشرہ یا ریاست کو دین کے علاوہ کسی چیز پر اُستوار کرنا

دین کو عملی زندگی سے الگ کرنا یا عملی زندگی کو غیر دینی بنیادوں پر قائم کرنا۔

سیکولرزم کی بڑی بڑی اقسام یہ ہیں:

سیکولر سیاست جیسے مغربی جمہوری نظام یا کمیونزم

سیکولر معاشرت جیسے مرد وزَن کی مغربی مساوات، حقوقِ نسواں کے مغربی تصورات

سیکولر اقتصاد جیسے مغربی سرمایہ دارانہ نظام یا سوشلزم

سیکولر تعلیم جو دینی اہداف وطریق کار سے آزاد ہو، جو وحی کو حجت تسلیم نہ کرے

سیکولر اخلاق جو انسان کے لیے کسی بھی مستقل قدر کو تسلیم کرنے سے انکار کرے

سیکولر فن واَدب جیسے رومانویت، واقعیت اور لامعقولیت کے ادبی فنی مکاتبِ فکر وغیرہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

"سیکولرزم ایک سائنسی طرزِ فکر ہے جو مذہب سے ہٹ کر سوچنا سکھاتی ہے۔ مذہب جن اُمور میں خاموش ہوتا ہے یا براہِ راست کوئی راہنمائی نہیں کرتا، وہاں پر غیر مذہبی یعنی سائنسی انداز سے سوچنا سیکولرزم ہے اور یہ دین کے منافی نہیں۔" سیکولرزم کا یہ معنی انتہائی محدود ہے اور کئی قسم کے مغالطوں کا مجموعہ ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سیکولر سیاست اقلیتوں کو تحفظ دیتی ہے کیونکہ وہ کسی مذہب کی حامی نہیں ہوتی اور یہ اسلام کا بھی حکم ہے کہ اقلیتوں کو تحفظ دیا جائے۔ سیکولرزم کا یہ مفہوم بھی ایک مغالطہ ہے کیونکہ سیکولرزم صرف اقلیتوں کے تحفظ کا نام نہیں بلکہ بے شمار لادینی اہداف وطریق ہائے کار کا نام ہے جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

مختلف افراد اور حکومتیں دین کے متعلق مختلف رویے اپناتی ہیں۔ اُن میں دو رویے زیادہ اہم ہیں:

1۔ بعض دین سے چشم پوشی کرتی ہیں جیسے لبرل ڈیموکریٹک حکومتیں۔ اِن حکومتوں کے نظام کو دین مخالف سیکولرزم(non religious) کہتے ہیں۔ یہ ایسے معاشروں پر مشتمل ہوتا ہے جو لادین ہیں لیکن بظاہر دین کے دشمن نہیں جیسے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے نظام ہائے حکومت۔

2۔ بعض سیکولر حکومتیں دین کی دشمن ہوتی ہیں اور کسی بھی صورت دین کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں، اُن کے نظام کو انتہا پسند سیکولرزم (Anti religious) کہا جاتا ہے۔ اِس قسم کا سیکولرزم رُوس میں قائم ہوا۔

سیکولرزم تین سطحوں پر قائم ہوتا ہے:

1۔ فرد کی سطح پر:

جب اُس کی مکمل توجہ دنیا پر محدود ہو جائے اور دین کو عملی زندگی سے یکسر الگ کردے۔ وہ آخرت کی ضرورت اور تاثیر سے مکمل علیحدگی اختیار کرے۔

2۔ معاشرے کی سطح پر:

جب معاشرے کو تعلیم، اخلاق، تہذیب وثقافت، سیاست واقتصاد، ادب ومیڈیا کے میدان میں دین سے علیحدہ کردیا جائے۔

3۔ ریاست کی سطح پر: جب اُس کے تمام انتظامی، قانونی اور عدالتی ادارے غیر دینی بنیادوں پر قائم ہوں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام میں سیکولرزم کی دونوں اقسام کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر وہ فکر جو اپنی مبادیات اور تطبیقات میں دینی نہ ہو، وہ دین مخالف ہے۔ چنانچہ اسلام اور سیکولرزم دو ایسے نقیض ہیں جو کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے اور اُن کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!

اسلام فقط مسجد ومدرسے اور نماز روزے تک محدود نہیں بلکہ وہ مکمل زندگی کا احاطہ کرتا ہے، چاہے وہ سیاست ہو یا قانون، گھر بار ہو یا کاروبار، نظامِ تعلیم ہو یا میڈیا وادب، داخلہ پالیسی ہو یا خارجہ وغیرہ۔ اسلام انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے احکامات لاگو کرتا ہے۔ اس میں دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔ دین دنیا کے تمام شعبوں میں داخل ہے اور دنیا دینی واُخروی فضائل کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسلام مادی علوم اور مادی ترقی کے بھی خلاف نہیں بشرطیکہ وہ دین کے ماتحت ہو، بالاتر نہ ہو۔

یورپ میں سیکولرزم کا ارتقا

جدید سیکولرزم کا آغاز وارتقا یورپ میں ہوا۔ جس کے دو بڑے مرحلے ہیں:

پہلا مرحلہ: جزوی سیکولرزم(1600-1800ء):

اس دور میں دین بتدریج نجی و شخصی معاملہ بن گیا لیکن ریاست ابھی بھی کلیسا کا تحفظ کرتی تھی اور اُس کی وصولیوں کے نظام کی سرپرستی کرتی تھی۔ لوگ مسیحیت کو حیثیت تو دیتے تھے لیکن وہ اس کی بعض تعلیمات کا انکار کرتے، مسیحیت کو عقل کے تابع کیا جانے لگا۔ اس دور میں 'ڈی ازم' کا نظریہ عام ہوا جو اللہ کے وجود کا اعتراف کرتا لیکن وحی اور الٰہی تعلیمات کو من گھڑت قرار دیتا۔ یہ جزوی سیکولرزم کا دور تھا جس میں معاشرتی سطح پر دین کی شکست وریخت جاری رہی۔ اس دور کے بڑے مفکرین والٹیر، جان لاک، ہوبز، ڈیکارٹ، بیکن، سپائی نوزا اور روسو وغیرہ ہیں۔

دوسرا مرحلہ: کلی سیکولرزم(1800 تا حال):

یہ سیکولرزم کے ہمہ گیر غلبے کا دور ہے۔ اس دور میں دین کو مکمل طور پر لغو قرار دیا گیا، غیبی اُمور سے انکار کیا گیا۔ اس دور میں ریاست نے کلیسا کی سرپرستی ختم کر دی۔ دین سے انحراف والحاد وبا کی صورت میں پورے یورپ پر چھا گیا۔ ریاست کے تمام شعبے سیاست، اقتصاد، تعلیم، معاشرت، اخلاق اور فنون وآداب دین سے آزاد ہوتے چلے گئے۔ یہ مکمل سیکولرزم کا دور ہے جب انفرادی، معاشرتی اور ریاستی سطح پر مسیحیت کی عمارت زمین بوس ہوگئی۔ اس دور کے مشہور مفکرین یہ ہیں: ہیگل، فیرباخ، ڈارون، فرائڈ، مارکس، ہیوم، کانٹ، وٹگنسٹائن، رالز وغیرہ

سیکولرزم اور عقل پرستی لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ وحی کے انکار کے بعد ضابطۂ حیات کا سب سے بڑا ماخذ عقل قرار پاتی ہے۔

عالم اسلام میں اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش

1۔ سیکولرزم کے نزدیک دین کو زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنا ضروری نہیں؟

سیکولرزم کے حامی کہتے ہیں کہ دین انسان اور ربّ کا انفرادی معاملہ ہے، دین کا اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں، دین جدید دور کے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

2۔ سیکولرزم کے حامی سود، پردہ، حدود الٰہی وغیرہ سے متعلق دینی احکامات کو لاگو کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک اِن احکام پر عمل درآمد کرنا رجعت پسندی، تعصب اور تنگ نظری ہے۔ یہ اُمور تہذیب، ترقی اور روشن خیالی کے منافی ہیں۔

3۔ سیکولرزم کے حامی ادیان کو برحق نہیں سمجھتے۔ وہ بظاہر تمام ادیان کا احترام کرتے ہیں لیکن اُن کے نزدیک کوئی دین دوسرے دین سے زیادہ معتبر نہیں ۔اُن کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ مختلف ادیان کے حاملین کے درمیان ایک قسم کی دوستی پیدا کی جائے۔ یہ بات اسلام کی حیثیت کے عین منافی ہے۔ اللہ کے ہاں قابل قبول دین فقط اسلام ہے۔ نیز اسلام اپنے مخالفین سے محبت ونفرت اپنے اُصول وقواعد کے مطابق سکھاتا ہے۔

4۔ سیکولرزم کے حامی دین کے داعیوں اور علما کا دائرہ زیادہ سے زیادہ تنگ کرتے ہیں تا کہ اُن کا معاشرتی اثر ورسوخ کم کیا جائے۔ وہ انھیں پس ماندہ، تنگ نظر اور جامد قرار دیتے ہیں۔ سیکولرزم کے حامی جہاد کی بجائے فقط ایسی دفاعی جنگ کے قائل ہوتے ہیں جو مادی مفادات کے لیے ہو، وہ دین کے غلبہ کی جنگ کو شر اور فساد قرار دیتے ہیں۔

5۔ سیکولرزم کے حامی دین کی بجائے وطن، قوم، رنگ، نسل اور قومی مفاد کے نام پر لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ سیکولر پارٹیوں میں دین کی بنیاد پر کوئی تقسیم نہیں ہوتی بلکہ دیگر مفادات ومعیارات پر تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے۔

6۔ سیکولرزم کا ہم نوا علما کا طبقہ، جدیدیت پسند ہوتا ہے جو اسلام کو کھینچ تان کر مغرب کے مطابق قرار دیتا ہے یا مغرب کے اُصولوں کو اسلام کی اصلی تصویر سمجھتا ہے۔

7۔ سیکولرزم کے حامی ثانوی درجے کے دینی مسائل پر خوب توجہ دیتے ہیں، لیکن اسلام کے بنیادی اور مہتم بالشان مسائل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ دین کے فروعی اختلافی مسائل کو نمایاں کرتے ہیں لیکن دین کے متفقہ اور اجماعی اُمور نظر انداز کر دیتے ہیں۔

8۔ سیکولر میڈیا میں دینی پروگراموں کا حصہ پانچ فیصد سے بھی کم ہوتا ہے اور 95 فیصد حصہ تفریحی یا معلوماتی پروگراموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سیکولر میڈیا کے دینی پروگرام اپنے معیار کے لحاظ سے انتہائی گھٹیا اور محدود موضوع کے حامل ہوتے ہیں۔ سیکولر پرنٹ میڈیا میں دین کی حیثیت ایک صفحے پر مشتمل ہوتی ہے جو 'دینی صفحہ' کہلاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ سیکولر لوگ دین کو فقط روحانی اُمور یا انفرادی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں۔

9۔ سیکولر نظام تعلیم میں دینی علوم کی نفی بجائے، ان کو نماز روزے اور شخصی عقائد ورسومات تک محدود کر دیا جاتا اور ان کا نصاب چند ورقوں پر مشتمل رسالہ ہوتا ہے۔ جو کبھی غیر علما اور کبھی غیر مسلم مفکرین کا تحریر کردہ ہوتا ہے۔ سیکولر جامعات میں مذہبی علوم ایک ڈیپارٹمنٹ پر مشتمل اور یونیورسٹی کے کونے کھدرے میں پائے جاتے ہیں، ان کو کسی دین سے منسوب علوم جیسے اسلامیات و عیسائیت کی بجائے زیادہ مناسب طور پر 'تھیالوجی' یا 'مذہبی علوم کا شعبہ' کہا جاتا ہے۔ ان میں کوئی اس مذہب سے غیر وابستہ جیسے ہندو شخص بھی ان علوم جیسے اسلامیات کی ڈگری حاصل کرکے، مستند وفاضل ٹھہر سکتا ہے، کیونکہ مذہبی علم کو معروضی طور پر عمل وپیروی سے بالاتر ہو کر پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ ایسے تعلیمی شعبوں میں تمام مذاہب کے مابین رواداری کی تلقین کرتے ہوئے، تمام مذاہب واہل مذاہب کو ایک میز پر ایک یکساں اور متفقہ حق کی جستجو میں مگن دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کام کرنے والے لوگ کسی مذہب کی حقیقت پر یقین رکھنے کی بجائے مذاہب کی مشترکہ سچائیاں تلاش کرکے ایک عالمی مذہب بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے باقی تمام علوم کے شعبوں میں بھی حسبِ ضرورت متعلقہ مذہب کی عبادات واخلاق پر مشتمل ایک رسالہ زیر تعلیم ہوسکتا ہے، لیکن کسی مخصوص علم کی رہنمائی اور اس کے بارے میں الہامی تعلیم کے بارے میں کوئی دلچسپی

نہیں رکھی جاتی۔

10۔ عالم اسلام میں سیکولرزم کے مشہور داعی یہ ہیں:
مصر: احمد لطفی، اسماعیل مظہر، قاسم امین، طہٰ حسین، جمال عبدالناصر، انور سادات
ترکی: مصطفیٰ کمال اتاترک، وغیرہ

ہندوستان میں 1791ء تک قانونِ سلطنت شریعت اسلامی کے مطابق تھا، پھر انگریز کی حکومت میں بتدریج شریعت کو معطل کیا گیا اور 1850ء تک یہ عمل مکمل ہوگیا۔

مصر، الجزائر، تیونس، مراکش، ترکی، عراق اور شام میں بھی اسی طرح شریعت کو بتدریج لغو کیا گیا۔

11۔ نظری طور پر سیکولر نظام حکومت کے تین اہم عناصر ہوتے ہیں: مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ
عملی طور پر نظامِ حکومت اشرافیہ کا ہو یا جمہوریہ کا، فوجی آمریت کا ہو یا شہری آمریت۔ دین کے الغا پر تمام سیکولر حکومتیں متفق ہوتی ہیں۔

یورپ میں سیکولرزم کی ابتدا کیسے ہوئی؟

یورپ میں سیکولرزم کی آمد سے قبل عیسائیت رائج تھی لیکن یہ دین عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہی پولس کے ہاتھوں تحریفات کا شکار ہوگیا۔ تثلیث اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دینا بنیادی ترین تحریفات تھیں۔

عیسائیت کی تحریف:

عیسائیت سے قبل روم میں ایسے دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی جن کا عوام کی عملی زندگی پر کوئی اثر نہ تھا۔ دیوتاؤں کی مندروں میں پوجاپاٹ کی جاتی لیکن عوام مندروں سے باہر اپنی عملی زندگی میں آزاد ہوتے۔ رومی عوام نے عیسائیت کو قبول کیا تو صورتِ حال کچھ زیادہ تبدیل نہ ہوئی۔ عیسوی شریعت کو سرکاری سطح پر نفاذ کا کبھی موقع نہ ملا اور وہ عوام کی عملی زندگیوں پر بھی لاگو نہ ہوسکی۔ کلیسا نے سیاسی مقبولیت تو حاصل کر لی لیکن دین اور ریاست کی تفریق مکمل عیسوی تاریخ میں قائم رہی بلکہ کلیسا نے اِسے ایک اُصول کے طور پر بھی قبول کر لیا۔

عیسائیت میں سب سے بڑی بدعت مذہبی پیشوائیت تھی۔ اِسی بدعت کے تحت اللّٰہ کے حلال وحرام میں مداخلت کی گئی، انسانوں کو ربّ تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا گیا اور غیر فطری انسان کش رہبانیت کو جنم دیا گیا۔ عیسائی مذہبی پیشوائیت نے لوگوں کو بخشنے اور محروم کرنے کا اختیار انسان پادریوں کے سپرد کیا جو پیسوں کے بدلے بخشش کے سرٹیفکیٹ کھلے عام فروخت کرتے۔

کلیسا کا جبر اَدیان کی تاریخ کا بدترین جبر تھا۔ اُس نے اپنے دنیوی مفادات کے لیے ظالم بادشاہوں کی پشت پناہی کی، روم کی اَن پڑھ جاہل عوام کو صدیوں تک اپنا غلام بنایا۔ مخالفین پر محکمہ تفتیش کے ذریعے ظلم وستم کا بازار گرم کیا۔ کلیسا کے طرف سے صدیوں تک کئی قسم کے مذہبی ومعاشی ٹیکس وصول کیے گئے جو عوام پر بھاری بوجھ تھے۔ عوام کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ کلیسا حیا، زہد، معافی اور درگزری کی تعلیمات کی خود خلاف ورزی کرتا۔ وہ بادشاہوں سے بڑھ کر ظالم، عیاش اور مال پرست ثابت ہوا۔

کلیسا کے خلاف تحریکیں:

کلیسا کی اِن خرابیوں کے خلاف بڑی بڑی عوامی اور عقلی تحریکیں اُٹھ کھڑی ہوئیں جیسے مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب اور تحریک احیاے علوم۔ اُمرا اور بادشاہ جو کلیسا کی طاقت سے خائف تھے، نے اِن کا ساتھ دیا۔ کلیسا کا زور بتدریج ختم ہوتا چلا گیا اور ردِّ عمل میں سیکولرزم کا آغاز ہوا۔ جدید علم نے خرافات پر مبنی مذہبی عقائد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ کاپرنیکس نے اس کلیسائی عقیدے پر ضرب لگائی کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ برونو اور گلیلیو نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ لوگوں کے ہاں کلیسا کا علم مشکوک ہوگیا۔ ڈیکارٹ، بیکن اور لاک نے وحی کے مقابلے میں عقل وتجربے کی عظمت کو پیش کیا۔ سپائی نوزا اور پاسکل نے اناجیل میں فاش غلطیاں پکڑیں۔ نیوٹن نے کائنات کا ریاضی اُصولوں کے مطابق ہونا ثابت کیا۔ پورے یورپ میں ڈی ازم کی تحریک چلی کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا لیکن وہ کائنات سے لاتعلق ہے۔ کائنات اپنے اصولوں کے مطابق خود بخود چل رہی ہے۔ یہی نظریہ بعد میں خدا کے انکار تک پہنچا۔ عقل پرستی اور فطرت پرستی کے اندھے رجحانات وحی اور کتاب مقدس پر غالب آئے۔

انقلاب فرانس:

انقلابِ فرانس (1789ء) تک کلیسا اور علم کی کشمکش خواص تک محدود تھی لیکن انقلاب فرانس کے بعد عوام تک پھیل گئی۔ عوام نے دین کو ترک کیا اور اُس کی دشمنی میں دیوانے ہوگئے۔

انقلاب فرانس ایک خون ریز انقلاب تھا جو بادشاہوں، جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے ظلم و استحصال کے خلاف پیدا ہوا۔ یہ یورپ کا پہلا انقلاب تھا جس نے عوام کی حاکمیت پر مبنی حکومت قائم کی اور اللّٰہ کی حاکمیت کا صریح انکار کیا۔ بادشاہوں اور کلیسا کے خزانے لوٹ لیے گئے۔ دینی عقائد کا شدت سے انکار کیا گیا۔ انقلاب سے قبل معاشرتی وسیاسی مفکرین نے فطری اور مثالی ریاست کے لادین نظریات پیش کیے۔ فلاسفہ نے دین سے آزادی کی دعوت دی جو خالص زندیقیت تھی۔ عوام لادین مفکرین اور فلاسفہ کے ہم نوا ہو کر کلیسا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لادینیت پر مبنی آزادی، مساوات اور اُخوت کے تصورات 'بنیادی انسانی حقوق' کہلائے۔ انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کے تمام حصوں میں انقلابات جوالہ مکھی کی طرح پھٹ پڑے۔ دین اور کلیسا کا اثرورسوخ ختم ہوگیا۔ عقائد اور اقدار میں خوف ناک خلا پیدا ہوا جس کو لادین فکری معاشرتی اور سیاسی تحریکوں نے پر کرنے کی کوشش کی۔

ڈارون تھیوری:

دین کے تابوت میں آخری کیل ڈارون کے نظریۂ ارتقا (1859ء) کے ذریعے ٹھوکا گیا۔ ڈارون نے یہ تھیوری پیش کی کہ انسان کائنات کی اندھی قوتوں کے تحت بندر سے بتدریج انسانی نوع کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کی کوئی خاص تخلیق نہیں اور نہ کوئی مخصوص ہدف۔ یہ کوئی باقاعدہ علمی نظریہ نہ تھا لیکن یورپ کی

دین بے زار فضا میں اس کو مسلّم قاعدہ سمجھا گیا۔ یورپی ماہرین نے اِس نظریے کی فنی و منطقی تردید کی اور اس کے کئی حصے ابھی بھی محتاجِ ثبوت ہیں لیکن انکارِ خدا کے شدید تقاضوں کے زیرِ اثر عوام میں بے حد مقبول ہو گیا۔ مستقل اقدار اور اخلاق کا تصور ختم ہو گیا۔ نطشے، مارکس اور فرائڈ جیسے دہریے اور دین کے پکے دشمن یورپ کے امام ٹھہرے جو زندگی کو مادہ پرستی اور جنس پرستی میں غرق کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ انسانی علوم مقصد وغایت سے جدا ہو کر بے ہدف میکانزم پر استوار کیے گئے۔ انسانی نسل کا ایسا خوف ناک فکری و جذباتی بحران برپا ہوا کہ یورپ کا فن وادب محرومی اور قلق کے کرب ناک احساسات سے بھر گیا۔ انسان کی حیوانیت اور مادیت مسلم ہوئی تو اقتصاد، سماجیات اور نفسیات کے علوم حرص وہوس اور شہوانیت سے لبریز ہو گئے۔ دین، شادی اور خاندان کو انسان کے قدیم دور کی خرافات کہا گیا۔ جدید علم کا دور بزعم خود انسان کے بنائے ہوئے اِن من گھڑت خیالات کی گنجائش نہیں رکھتا۔

یورپی شعبہ ہائے زندگی میں سیکولرزم کا ارتقا

سیاست: مسیحی دور میں کلیسا کو انتہائی قوت نصیب ہونے کے باوجود عیسوی شریعت ملکی قانون نہ بن سکی۔ لیکن اس کے باوجود مسیحیت کا شہنشاہوں اور عوام کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوتا تھا۔ شہنشاہ دین پر عمل نہ کرتے تھے لیکن خود کو دین کا سپاہی مانتے اور ملک میں دین کی مکمل سرپرستی کرتے۔ کلیسا کو شاہوں کے زیرِ سایہ دین کو پروان چڑھانے کی مکمل آزادی تھی اور اُن کا شاہوں کو عوامی مقبولیت دلانے میں خاص کردار ہوتا۔

یورپی سیاست میں لادینیت کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب یورپی مفکرین نے ایک تخیلاتی ریاست کا نقشہ پیش کیا۔ اس نقشے میں دین کے بغیر ایک عمدہ ریاست کا امکان پیش کیا گیا۔ اس کے بعد 'معاہدۂ عمرانی' کا تصور پیش ہوا کہ ریاست عوام اور حکمران کی باہمی رضامندی اور معاہدہ پر مبنی ہوتی ہے۔ معاہدۂ عمرانی کے قائلین میں سب سے بڑا مفکر روسو تھا۔ روسو نے ریاست کو دین سے الگ قرار دینے پر زور دیا۔ روسو کی کتابیں مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ تھیں۔ انقلابِ فرانس کے ساتھ ہی لادین وطنیت، قومیت اور دنیویت کو مقبولیت ملی اور مسیحیت، دینی عالم گیریت اور اُخرویت کو زوال آ گیا۔ مسیحی دور میں میکیاولی نے ریاست کو دین، انسانیت، اخلاق اور اُصول سے یکسر آزاد قرار دیا۔ کلیسا نے اُس کی کتابوں پر پابندی لگائی لیکن یورپ میں الحاد عام ہوتے ہی اُس کو پھر عروج نصیب ہوا۔

یورپ میں دین کے زوال کے ساتھ ہی اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی نظام غالب آ گیا یعنی دینی قوم، دین کا محافظ بادشاہ، زرعی جاگیر دار اور کلیسا جو وسیع دینی اجتماعیت کی علامات تھیں، اُن کے بجائے انفرادی سرمایہ داری، انفرادی منفعت اور انفرادی حریت غالب آ گئی۔ اس انفرادی نظام کو لادین لبرل ڈیموکریسی کہا گیا۔ اس کا سب سے بڑا دعویٰ تھا کہ وہ فکری، معاشرتی، معاشی اور سیاسی آزادیاں اور حقوق دیتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد یہ یورپ کا مقبول ترین نظام تھا لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ ڈیموکریسی سرمایہ داروں کا عوام کو دبانے اور پیسنے کا ایک آلہ ہے۔ یہ مال داروں کی آمریت ہے۔ اس میں سرمایہ دار میڈیا کے ذریعے عوام کی رائے کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ اس میں عام اور خاص کی رائے برابر ہوتی ہے۔ اس میں اکثریت کی رائے کے احترام کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن عملاً سرمائے کی حکومت ہوتی ہے۔ لبرل ڈیموکریسی کبھی بھی دین کو عملاً نافذ نہیں کرتی بلکہ دین کو کمزور کرتی ہے تاکہ انفرادی حریت کا تحفظ ہو۔ لبرل ڈیموکریسی کے ردِّ عمل میں کمیونزم کا تصور آیا۔ اِس کا خیال تھا کہ تمام مسائل کی جڑ انفرادی ملکیت ہے لہٰذا اس کو ختم کر کے مزدوروں کی حکومت قائم کی جائے جو تمام ملکیّتوں کو ریاست کے کنٹرول میں لا کر خوش حالی کو تمام خاص وعام تک پہنچائے۔ کمیونزم تاریخ کی بدترین آمریت ثابت ہوئی جس میں حکمران پارٹی نے عوام کو جبر واستبداد کے شکنجے میں اس قدر کسا کہ کلیسائی دور کے جاگیر دار اور شہنشاہ بھی شرما جائیں۔ کمیونزم لبرل ڈیموکریسی کے مقابلے میں دین کا سخت دشمن ثابت ہوا۔ اُس نے اپنے علاقوں سے دین کی تمام علامات، رسوم اور طریقوں کو بالجبر مٹا ڈالا۔ دہریت پورے پورے ملک کا سرکاری جبری دین قرار پایا۔

اقتصاد: مسیحی دور میں رہبانیت کے زیرِ اثر ہر قسم کی کمائی اور معاشی دھندے کو برا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب کلیسا کی بداعمالیوں کے سبب لوگوں کا مسیحیت پر اعتماد کمزور ہوا تو کئی لادین اقتصادی نظریات پیدا ہوئے۔ جن میں سب سے پہلا فطرت پرستی (فزیو کریسی) تھا۔ اس مکتبِ فکر کا خیال تھا کہ جس طرح کائنات طبعی اصولوں کے مطابق چل رہی ہے اسی طرح اقتصاد کو بھی کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ فطری اصولوں پر خود بخود چلتی ہے۔ فطرت پسندوں کا خیال تھا کہ دین فطرت کے منافی ہے۔ فطرت پسندی کے نظریے کو نوزائیدہ سرمایہ دار طبقے نے خوب استعمال کیا اور مال داروں کے تمام غیر انسانی طریقے فطری قرار پائے۔ حریتِ عمل، حریتِ فرد اور ذاتی مصلحت کی آڑ میں عوام کو خوب لوٹا گیا، آخر کار فزیو کریسی کا نظریہ متروک قرار پایا۔

فطرت پسندوں کے بعد لادین سرمایہ داری مقبول ہوئی جو 'کلاسیکل سرمایہ داری' بھی کہلاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مفکر آدم سمتھ تھا جس نے خود غرضی، حرص وحسد اور ذاتی منفعت کو عین خیر قرار دیا، اس سے پہلے یہ اوصاف دین کے زیرِ اثر صدیوں سے مذموم قرار دیے جاتے تھے۔ آدم سمتھ کے اُس دور کے استعمار پسندوں پر نہایت خوف ناک اثرات پڑے۔ دوسرا اہم کلاسیکی سرمایہ دار مفکر مالتھس تھا جس نے آبادی پر کنٹرول کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ غریب لوگوں پر خرچ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ غیر پیداواری خرچ ہے اور جب تک کوئی شخص کوئی خدمت پیش نہ کرے، اس کو روٹی نہیں ملنی چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ محروم طبقے معاشرے پر غیر فطری بوجھ ہیں جو کثرتِ پیدائش کی وجہ سے ہیں۔

کلاسیکل سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں کمیونزم کا تصور پیدا ہوا۔ اس تصور کے لوگ خاندان، شادی، انفرادی ملکیت، دین اور فضائل و نیکیوں کو ڈھکوسلا سمجھتے تھے جو سرمایہ دار طبقے نے عوام کو لوٹنے کے لیے ایجاد کیے۔ کمیونزم دین کا سخت دشمن تھا اور ساری انسانی تاریخ کو معاش کی جنگ قرار دیتا۔ کمیونزم کے اہم نظریات میں ہیگل کی جدلیت، ڈارون کا تنازع للبقا، فیرباخ کا الحاد اور مارکس کی مادیت، تاریخ کی مادی تشریح اور انفرادی ملکیت کے خاتمے کا تصور ہے۔

لادین اقتصاد کے دو بڑے ستونوں لبرل سرمایہ داری اور کمیونزم کی وجہ سے ساری دنیا دو بڑے بلاکوں میں تقسیم ہوئی:

1۔ امریکی بلاک جو سرمایہ دار ملکوں کا سربراہ ہے۔

2۔ روسی بلاک جو کمیونسٹ ملکوں کا سربراہ ہے۔

سرمایہ دار ملکوں کو آزاد دنیا قرار دیا جاتا ہے حالانکہ خدا کے انکار اور مادیت کی وجہ سے وہاں بدامنی، بے سکونی اور جرائم عام ہیں۔ خیر و شر کا فرق مٹ چکا ہے۔ انسانوں پر آلات کی حکمرانی ہے۔ اخلاقی روایات، سعادت اور نیکی کے تصور ختم ہو گئے۔ میڈیا اپنے پروپیگنڈے سے ایک فکری جبر قائم کیے ہوئے ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار کے لیے ہر جائز وناجائز طریقے استعمال کرتا ہے۔

کمیونزم بھی مادیت، اخلاقی دیوالیہ پن اور الحاد میں سرمایہ داروں سے پیچھے نہیں۔ اُس نے دین، شادی اور دینی اخلاق کو ریاستی جبر سے منہدم کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد اُس کا عوام و مزدوروں پر خوف ناک تسلط ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ریاست کا غالب ترین حصہ ایک تاریخی استبداد کا شکار ہے۔

علوم: مسیحیت اور سائنس کے درمیان کشمکش کا آغاز اُس وقت ہوا جب کلیسا نے کہا کہ زمین چپٹی ہے اور سائنس نے کہا: گول۔ کلیسا نے کہا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور سائنس نے کہا کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ کلیسا نے مکمل بائبل کو وحی الٰہی کہا اور عقل پرست مفکرین نے اس میں سے فاش غلطیاں ڈھونڈ نکالیں۔ کلیسا نے رہبانیت کو متبرک قرار دیا اور جدید علم نے اِسے انسانی ہلاکت کا یقینی ذریعہ ثابت کیا۔

اس کشمکش میں دین مغلوب ہو گیا۔ دین کو خرافات اور جھوٹے افسانوں پر مبنی سمجھا گیا۔ علوم و فنون میں دین کی رائے کو علمیت کی شان کے منافی سمجھا گیا۔ علم اور دین کے درمیان عارضی تعارض کو ایک مستقل مخاصمت میں بدل دیا گیا جس میں یہ سمجھا گیا کہ دین ہمیشہ غلط ہو گا اور سائنس کی بات ہمیشہ درست ہو گی۔ فلاسفہ کے نزدیک 'فکری آزادی' آزادی کی سب سے بڑی قسم قرار پائی۔

علم اور دین کے درمیان جدائی ڈالنے سے معاشرے پر خوف ناک اثرات ظاہر ہوئے۔ ہر قسم کے تعلیمی مناہج اور بحث و تحقیق کو دین کے ہر رنگ سے الگ کر دیا گیا۔ معاشرے کا غالب ترین حصہ جو مادی علوم کا طالب علم تھا، دین پر اپنے اعتقاد کو قائم نہ رکھ سکا۔ معاشرے میں پڑھے لکھے ملحدوں کی ایک فوج ظفر موج تیار ہو گئی۔ دین کو ماننے والے ضعیف العقل اور بے وقوف قرار پائے۔ ڈیکارٹ کی پیدا کی گئی علم اور دین کی جدائی ایک مستقل تفریق میں بدل گئی۔ ڈارون تھیوری نے انسانی زندگی کو بے مقصدیت کے سمندر کے حوالے کر دیا۔ اس سے انسانی نسل انارکی، قلق، محرومی اور ناقدری سے بھر گئی۔ لاتعداد فلسفیانہ مکاتب فکر پیدا ہوئے جو باہم دست و گریبان تھے۔ تاریخ انسانی میں پہلی دفعہ اخلاقی اقدار اور خالص عقل کے درمیان جنگ ہوئی۔ علم معرفتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن یورپ اس سے محروم ہوا۔ یورپی علم کئی صدیوں سے استقرار کا حامل نہیں۔ ہر صدی کے مفکر پچھلی صدی کے مفکرین کا رڈ کرتے ہیں۔

معاشرت واخلاق:

قرونِ وسطی میں اخلاق واقدار مستقل بالذات اور دین کی سند پر قائم تھیں۔ لوگ خیر وشر کی پہچان کے لیے دین کو پیمانہ بنانے کے عادی تھے۔ کلیسا بذاتِ خود افراط و تفریط کا شکار تھا لیکن اس کے باوجود مسیحی اخلاق سے خروج کو ناپسند کیا جاتا۔

جب لادین مفکرین کا دور آیا تو میکیاولی اور ہوبز نے کلیسا کے مدمقابل یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان فطرتاً شریر ہے اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں بھیڑیا ہے۔ سپائی نوزا نے لذت کو فی نفسہٖ خیر قرار دیا اور اَلم کو فی نفسہٖ شر۔ آگسٹ کومٹے نے الٰہی دین کے مقابلے میں انسانی وضعی دین کی بنیاد رکھی۔ اس کے خیال میں انسانی وضعی دین فطرت کے عین مطابق ہے اور الٰہی دین فطرت کے مخالف۔

روسو کا خیال تھا کہ اخلاق کے لیے ایمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محض دنیوی مصالح سے ہی اخلاق تشکیل پاتے ہیں۔ وہ فرانسیسی انقلاب کا ہیرو تھا اور اُس کی کتاب سوشل کنٹریکٹ یعنی 'معاہدہ عمرانی' فرانسیسی انقلاب کی انجیل۔

کانٹ نے انسانی اخلاق کے تین مراحل بنائے۔ پہلے مرحلے میں اخلاق خرافات پر مبنی تھے۔ پھر ادیان کے زیر اثر آئے، اب وہ انسانی علوم کے مرحلے میں ہیں۔ ہر مرحلہ پچھلے مرحلے سے آزاد ہوتا ہے۔ کانٹ کے نزدیک دینی اخلاق لغو اور وہم ہیں۔ ادیان کے تصور اُلوہیت و آخرت کی جگہ پر انسانیت کو لانا چاہیے۔

درخائم کلاسیکی معاشرتی مفکر ہے۔ اس کے خیال میں معاشرے کی مجموعی عقل اندھی بہری ہوتی ہے اور نامعلوم اسباب و علل کے تحت فیصلے کرتی ہے اور اسکے سامنے انفرادی عقل بے بس ہوتی ہے۔ ادیان کی فکر بھی اللہ سے نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ مختلف نفسیاتی انفعالی جذبات کا نتیجہ ہے۔ ہر معاشرے نے اپنے معبود خود گھڑ لیے۔

کمیونزم نے بھی خدا کا انکار کیا اور فقط مادے پر ایمان لایا۔ اس کے نزدیک حقیقتِ اولی فقط مادہ ہے۔ ادیان، اخلاق اور خاندان کے تصورات اس لیے گھڑے گئے تا کہ بورژوا طبقہ پرولتاری طبقے کا استحصال کر سکے۔

یورپ کا مقبول عام معاشرتی واخلاقی مکتبِ فکر جرمی بینتھم کا نظریہ نفعیت ہے۔ یعنی خیر وہی ہے جو دنیا میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دنیوی افادے کا سبب

بنے۔ یہ تصور آخرت پرستی اور للّٰہیت کی ضد ہے۔
21ویں صدی میں تحلیل نفسی اور سلوکیت کے نفسیاتی مکاتبِ فکر نے انسان کو مجبورِ محض قرار دیا۔ انسان یا تو لاشعور کے ہاتھوں مجبورِ محض ہے یا خارجی واقعات کا میکانکی معلول۔ ان مکاتب نے انسان کو محض ایک حیوان یا مادہ قرار دیا۔

نسوانیت: کلیسائی اور جاگیر داری دور میں عورت کو کم تر مخلوق سمجھ کر اُس کو ادنیٰ اور رذیل زندگی پر مجبور کیا جاتا۔ لیکن اُس دور کی عورت مرد کی عزت وناموس سمجھی جاتی اور اُس کی بے پناہ حفاظت کی جاتی۔

انقلاب فرانس کے بعد عورت کے حقوق کی پہلی چنگاری پھوٹی۔ صنعتی انقلاب کے بعد عورت گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے علاوہ صنعتوں میں مزدوری بھی کرنے لگی۔ اُس نے بتدریج سیاسی حقوق کا مطالبہ بھی کیا۔ بالآخر وہ معاشرتی وسیاسی سطح پر مرد کے برابر قرار پائی۔ اُسے مساوات، معاشی استقلال اور آزادانہ ماحول نصیب ہوا۔ 1950ء تک عورت کو معاشرتی وسیاسی حقوق تو حاصل ہوگئے لیکن 'حقوق کی تحریک' آزادی کی تلاش میں مزید آگے بڑھ گئی۔ عورت بتدریج گھربار، خاوند اور بچوں کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوئی۔ طلاقیں عام ہوئیں، تنہا ماؤں کا بڑا گروہ وجود میں آیا، سیکس انڈسٹری مضبوط ہوئی اور 1960ء میں مانع حمل گولیوں کی ایجاد سے فحاشی مزید آزاد ہوگئی۔

عورت کی مادر پدر آزادی کے ساتھ ہی بے شمار اخلاقی مفاسد پیدا ہو گئے۔ زنا سے پیدا ہونے والے بچے، گھریلو خاندانی زندگی کا انہدام، عورت کے مسائل میں اضافہ... اس نئی طرز زندگی کے کڑوے پھل تھے۔ بچوں کی تربیت ماں باپ کے بجائے نرسری ہومز کے سپرد ہوئی جہاں سے وہ کئی انحرافات کا شکار ہوئے۔ کھلی جنسی آزادی کے باوجود جنسی انحرافات اور ہم جنسی پرستی عام ہوئی بلکہ قانوناً جائز قرار پائی۔ خاندانی بگاڑ کی وجہ سے جرائم، نفسیاتی امراض اور منشیات کے استعمال میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ عورت کی آزادی اور بدلے میں خاندانی تباہی کے مصائب کمیونسٹ معاشرے کا بھی حصہ تھے لیکن وہ اُس کو صرف سرمایہ دار دنیا کا حصہ بتلاتا رہا۔

عصر حاضر میں تحریک حقوق نسواں کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس نے اپنا ایجنڈا اقوام متحدہ کے بنیادی چارٹر میں داخل کرا لیا ہے۔ جس کے مطابق جنس کے اعتبار سے عورت ومرد کے حقوق برابر ہیں۔ 1955ء کی خواتین عالمی کانفرنس کے بعد اکثر ممالک نے اسی ایجنڈے کو قبول کر لیا ہے۔ مغرب کے تمام اہم سیاسی واقتصادی نظریات اس وقت اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے دنیا میں پروان چڑھ رہے ہیں، جیسے معاشرے میں سیاسی تفریق، عوامی حاکمیت، قومیت کا نظریہ اور ہم جنس پرستی وغیرہ

اسلام نے عورت ومرد کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے عورت کو بے پناہ حقوق دیے ہیں لیکن اُس کا دائرہ کار مرد کے دائرہ کار سے مختلف بنایا ہے۔ اللّٰہ نے خاندانی انتظامی اُمور میں مرد کو عورت پر نگران بنایا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اللّٰہ نے دونوں کے لیے الگ الگ حقوق وفرائض بھی مقرر کیے ہیں۔

ادب وفن:

مسیحی دور میں فن وادب دینی روایات اور کلیسائی اقدار کے ارد گرد گھومتا تھا۔ لیکن سترہویں صدی کے بعد عہد بیداری کے ساتھ ہی یونانی ورثے کو زندہ کیا گیا جس میں مذہبیت کا نام ونشان نہ تھا، اس کو نو کلاسیکی دور کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چونکہ اِس دور کا فن وادب کلیسائی الٰہ کے بجائے عام انسانی زندگی کو موضوع بناتا، اِس لیے اِس کو ہیومنزم کا نام بھی دیا گیا۔ دانتے، جیوتو اور شیکسپیئر اس دور کے اوّلین فن کار ہیں جنہوں نے دین سے آزاد فن وادب کی عکاسی کی اور اُس دور سے آج تک فن وادب دین سے آزاد ہی چلا آرہا ہے۔ کلیسائی دور کے ادب وفن پر رہبانیت غالب تھی لیکن عہد بیداری میں ردّ عمل کے تحت اَبیقوریت [یونان کے مشہور حکیم اپیکورس کا فلسفہ اور نظام جس میں حصولِ لذت کو افعالِ انسانی کی اصلی غرض بتایا گیا ہے: لذت پسندی، عیش پرستی، لذتیت۔ اسی نے نظریۂ ذرات کو بھی پیش کیا جو ایک طرح سے ابیقوریت کا احیا تھا۔ (تاریخ فلسفہ جدید: ا/ 290)]، لذت پسندی اور عقل پرستی غالب رہی۔ بیداری کے قائدین نے ہزار سالہ کلیسائی عہد کی عمارت منہدم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

انقلاب فرانس کے بعد جدید دور کا آغاز ہوا جس میں دو مکاتب فکر نہایت اہم ہیں:

1۔رومانیت:

اِس نے دینی ذوق وشوق کے بجائے محبت، حسن وعشق اور جذباتی خوشی والم کو موضوع بنایا۔ عقل ودین کے بجائے جذبات کی عکاسی ہوئی۔ آخرت کے بجائے دنیا کی سرمستی کو اجاگر کیا گیا۔ فطرت کو اللّٰہ کی جگہ پر رکھ کر پوجا گیا۔

2۔واقعیت:

رومانیت مثالی کردار کی علم بردار تھی۔ واقعیت نے اِس کے برعکس عام انسان کی زندگی کو موضوع بنایا۔ واقعیت نے زندگی کے مسائل کے حل کی کوشش کی لیکن غیر دینی الحادی بنیادوں پر۔ یہ مکتبِ فکر دین، مذہب اور اقدار کا دشمن تھا۔ واقعیت نے دین پر براہ راست حملے کیے اور فحاشی وفسق وفجور کی کھلی دعوت دی۔

معاصر دور واقعیت سے لامعقولیت کی طرف سفر کا دور ہے: لامعقولیت زندگی کی ناقدری، بے بسی، بے گانگی اور روحانی تنہائی کو موضوع بناتا ہے۔ یہ فرائڈ، ڈارون جیسے ملحد مفکرین، عالمی جنگوں کے مسائل اور مذہب سے یکسر علیحدگی کی وجہ سے انسانی غم والم کو ادب وفن کا سب سے بڑا موضوع بناتا ہے۔

معاصر ادب کے دو بڑے رجحانات ہیں:

1۔اباحیت:

یہ یورپ کے ہر دور کا اہم رجحان ہے لیکن معاصر ادب میں اباحیت عریاں جنسی ادب تک پہنچ گئی۔ ساٹھ کی دہائی میں غلیظ جنسی ادب ہر طرف پھیل گیا۔ انسان کی جنسی زندگی کی بھرپور تصویر کشی کی گئی۔

2۔ضیاع:

یہ رجحان انسان کی تنہائی اور بیگانگی کو بیان کرتا ہے، جو

جدید تہذیب کی ترقی اور مذہب کے زوال کے ساتھ ہی ہر بڑے شہر میں معاشرے کے ہر انسان کے جسم وجان کا حصہ ہے۔ زندگی کی بے مقصدیت کا احساس سارتر کی وجودیت کی شکل میں انسان کو حریت میں غرق کرتا ہے اور کاموکے ہیرو کی شکل میں خالص لذات کو تلاش کرتا ہے۔ ضیاع کا ادب ادیان کا انکار کرتا ہے جس کی وجہ سے اُس پر گہری مایوسی اور قنوطیت چھائی ہے۔ وہ کسی بھی قدر کو مستقل تسلیم کرنے سے عاری ہے۔ اُس کا اپنی ذات پر اعتماد ختم ہو چکا ہے۔

عالم اسلام میں سیکولرزم کے داخل ہونے کی وجوہات

مغرب میں سیکولرزم اس لیے وارد ہوا کیونکہ اُن کا دین تحریف شدہ تھا جبکہ اہل اسلام میں سیکولرزم اِس لیے داخل ہوا کیونکہ وہ اپنے صحیح دین سے منحرف ہوگئے اور دین کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے۔

اہل اسلام کا اپنے دین سے انحراف: اہل اسلام کا اپنے دین سے انحراف سب سے پہلے عقیدے یعنی توحید اُلوہیت کے مفہوم میں پیدا ہوا۔ مسلمان عبادت کے جامع تصور کو بھول گئے اور عبادت چند مخصوص اعمال اور اذکار واَوراد میں سمٹ آئی۔ زندگی کے تمام شعبے بتدریج اسلام سے خالی ہوتے چلے گئے۔ دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوگئی۔ تعلیم جہاد سے عاری ہوکر خالص صوفی تربیت میں تبدیل ہوگئی۔ اُمت مقبروں، مزاروں اور مردوں کے تقدس میں غلو کر کے شرک میں مبتلا ہوگئی۔ دین سے انحراف مغربی عسکری یلغار سے بھی پہلے واقع ہو چکا تھا۔

اہل اسلام کا دوسرا انحراف 'احکام الٰہی کی معاشرے پر حاکمیت کے تصور' میں تھا۔ صفوی اور مغلیٰ سلطنتیں تو ویسے ہی اسلام کی حقیقت سے دور تھیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ عثمانی سلطنت نے بھی شریعت کی حاکمیت کو آخری ادوار میں مکمل روح کے ساتھ نہ اپنایا۔ عثمانی دورِ زوال میں حنفی فقہ نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جس کی وجہ سے بالآخر مغربی وضعی قوانین درآمد کرنے پڑے۔ عثمانی فوجوں کی تربیت کے لیے غیر مسلم ماہرین کی امداد طلب کی گئی۔ عثمانی سلطنت نے شوریٰ کے بجائے جبر و استبداد کو لازم پکڑا حالانکہ ہمسایہ یورپی ممالک میں حریت کی تحریکیں برپا تھیں۔

اہل اسلام کا تیسرا انحراف قضاوقدر میں انحراف تھا۔ شروعِ اسلام میں ایمان بقضا وقدر ہمت، قوت اور اقدام پر اُبھارتا تھا لیکن آخری صدیوں میں یہ عقیدہ پستی اور ذلت کو برداشت کرنے کا ایک بہانہ بن گیا۔ یقیناً یہ انحراف سنتِ الٰہی سے غفلت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اہل تصوف نے دین و پس ماندگی اور کفر و ترقی کو لازم ملزوم سمجھا۔

اہل اسلام کی ذہنی پستی کا یہ عالم پیدا ہوا کہ وہ خود غیر مسلموں کی غلامی کے لیے تیار ہوگئے۔ مسلمان تاتاریوں سے بھی شکست خوردہ ہوئے تھے لیکن اُس وقت وہ ذہنی غلام نہ بنے تھے۔ 19ویں اور 20ویں صدی کی عسکری شکست تہذیبی اور فکری غلامی بھی ساتھ لائی۔ مسلمان لادین حریت اور مساوات کو عین مقاصدِ شریعت قرار دینے لگے۔ عوام قوت و حکومت کا مصدر ٹھہرے۔ لادین اشتراکیت کو اسلام کے مطابق قرار دیا گیا۔ لادین جمہوریت کو اسلامی شوریٰ سے ماخوذ سمجھا گیا۔ لادین دستور کو عدل پر مبنی قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کی تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ جب بھی شکست خوردہ ہوئے تو داخلی کمزوری کی وجہ سے ہوئے۔ خارجی قوتیں جس قدر طاقت ور اور مضبوط ہوں، وہ مسلمانوں کو ہرا نہ سکیں، ہاں اُس وقت جب مسلمان خود اسلام سے دور ہوئے۔ مسلمانوں پر چار خارجی قوتیں حملہ آور ہوئیں اور انھوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا۔

1۔استعمار:

استعمار نے پورے عالم اسلام پر قبضہ کیا اور اِس دفعہ اُس نے خود کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ اُس نے کفر و اسلام کی جنگ کو محض اقوام اور ممالک کی جنگ قرار دیا چنانچہ عثمانیوں کے خلاف مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔

عالم اسلام کی جہادی تحریکیں جیسے مہدی سوڈانی، عمر مختار، عبدالقادر جزائری، شاہ اسماعیل شہید اور امام حسن البنا کی تحریک کو سختی سے کچلا گیا۔ استعمار نے بلادِ اسلامیہ پر قبضہ کرتے ہی وہاں سے شرعی قوانین لغو کیے۔ 1800ء سے 1950ء کے دوران تمام اسلامی ممالک نے شریعت کو چھوڑ کر انسانی وضعی قوانین کو جاری کیا، ان معاشروں میں قرآن وسنت کی جگہ 'دستورِ مملکت' نے لینا شروع کر دی۔ استعمار نے اسلامی نظام تعلیم کے مقابلے میں لادین نظام تعلیم رائج کیا۔

استعمار نے بعض علاقوں میں دینی تعلیم کے مراکز کو اصطبل بنایا۔ غیر اسلامی فرقوں اور گروہوں کو گمنامی سے نکال کر مسلم معاشروں میں تقویت دی گئی جیسے شام کے نصاریٰ، نصیریہ فرقہ وغیرہ۔ بعض نئے کافر فرقے پیدا کیے گئے جیسے بابی، بہائی اور قادیانی۔ استعمار نے بعض علاقوں میں 99فیصد اکثریتی مسلم علاقے میں غیر مسلم اقلیت کو حکومت سونپی۔ مسلمانوں کی نسل کو اپنا کارندہ بنانے کے لیے مخصوص افراد کو مسلمانوں کے راہنما بنا کر پیش کیا گیا۔

2۔مستشرقین:

دوسرا خارجی عنصر مستشرقین کا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اُن کے دین سے منحرف کرنے کے لیے علم کے نام پر ہر غیر علمی حربہ استعمال کیا۔ قرآن، نبی اکرم ﷺ اور اسلام پر اعتراضات اور شکوک کی بھرمار کی گئی۔ اسلام کو محض انفرادی دین کہا گیا۔ اسلامی تاریخ کے محاسن سلب کرکے عیوب نشر کیے گئے۔ مسلم عورت کو ذلیل قیدی کے طور پر پیش کیا گیا۔ عربی زبان اور اسلامی فقہ کو عصر حاضر کے ناموافق قرار دیا گیا۔ قدیم باطل فرقوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ قدیم لادین تہذیبوں کو اسلام کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا۔ جیسے فرعونیت، فینقیت، آشوریت، حمیریت وغیرہ۔

مستشرقین نے اُصول تحقیق کا ایک ایسا غیر علمی منہج پروان چڑھایا جو اسلامی روایت سے یکسر کٹا ہوا تھا اور علم کے نام پر ایک دھوکہ اور فریب تھا۔

3۔ مبشرین:

تیسرا خارجی عنصر مبشرین کا تھا۔ یہ غریب مسلم عوام میں سکول، کالج، ہسپتال اور غذا و روزگار کے کیمپ قائم کرتے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد کو دینی روح سے بیگانہ کرتے۔ انھوں نے مسلم عورت کو دین سے دور کرنے کے لیے ادب وثقافت کے نام پر بے حیائی اور بے پردگی کو فروغ دیا۔ انھوں نے دین کی بنیاد پر دوستی دشمنی ختم کی، مسلمانوں کے خیر خواہ بن کر سامنے آئے لیکن عالم اسلام کی نگرانی اور جاسوسی کرکے استعمار کی خدمت کی۔

4۔ عرب نصاریٰ:

چوتھا خارجی عنصر عرب کے نصاری کا تھا۔ اُنھوں نے سب سے پہلے سیکولرزم، قومیت، وطنیت اور لادین عقلیت کی دعوت دی۔ انھوں نے لادین سیاسی پارٹیاں، الحادی ادبی مکاتب فکر اور مذہب بے زار سماجی گروہ قائم کیے۔ اُنھوں نے کہا کہ دنیا کی ترقی کے لیے مذہب کو خیر باد کہنا پڑے گا جیسے یورپ نے دین سے جی چھڑا کر ترقی کی۔

عالم اسلام میں سیکولرزم کے اثرات

سیاست و قانون: ترکی:

قرونِ اخیرہ میں عالم اسلام اسلام کے مثالی سیاسی نظام سے کافی حد تک ہٹ چکا تھا اور اُس پر ایک گہرا جمود بھی طاری ہوچکا تھا۔ عوام اور حکمران اسلامی تصورات اور اُن کی عملی تطبیق میں کمزوری کا شکار تھے۔ مسلمانوں کا زوال اتنا خوف ناک تھا کہ وہ خود سیکولرزم کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ شروع میں اصلاحات کا نعرہ لگایا گیا۔ اصلاح کی ضرورت مسلّم تھی لیکن اُس کا طریق کار دھندلا تھا۔ چنانچہ اصلاحی مفکرین نے مغربی تمدّن کی ہیبت مسلم عوام کے دلوں میں پیدا کی اور اسلام کی عظمت کو کمزور [آخری ادوار میں خلافتِ عثمانیہ ہی اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی سرپرست تھی۔ اس خلافت نے عروج کی چھ صدیاں دیکھیں اور دنیا کے تین براعظموں پر حکومت کی۔ یورپ کے قلب تک مسلسل دو صدیوں تک یہ خلافت برسرِ جہاد رہی اور اس نے مغرب کی عسکری نفسیات پر کمزوری کے مسلسل وار کیے۔ لیکن دورِ زوال میں اسلام سے بعض بنیادی انحرافات نے اس کی اصل طاقت کو کمزور کر دیا۔ عثمانیوں نے اپنے عروج کی وجہ اسلام کی بجائے، اپنی ترک قومیت کو بتانا شروع کیا، جس کے نتیجے میں باقی مسلم دنیا پر وہ غاصب و قابض ٹھہرنے لگے۔ یہی قومیت کا فتنہ عرب اقوام کے اندر بھی پروان چڑھا جس سے ملی وحدت پارا پارا ہوگئی اور آخر خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے ہوگئے۔] کیا۔ آخر انقلابی تحریک پیدا ہوئی جس نے سلطان عبد الحمید کے وسیع اختیارات ختم کرکے دستوری حکومت کا مطالبہ کیا۔ عوام وخواص سلطان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ 1909ء میں انہیں خلافت سے بالجبر علیحدہ کر دیا گیا اور بتدریج ایک دستور نافذ کیا گیا جو لادین اہداف پر مشتمل تھا، یعنی وطن کے نام پر مسلم وغیر مسلم کو برابر قرار دیتا، حریتِ مذہب پر زور دیتا۔ اُس نے شرعی عدالتوں کو معطّل کیا اور اسلام دشمن عناصر کو کھلا چھوڑ دیا۔

ترکی کے اس دور کے سیاسی حالات کے نتیجے میں کمال اتاترک ترکی کا نجات دہندہ بن کر سامنے آیا۔ اس نے خلافت کا منصب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ دینی حکومت کو لادین جمہوریت میں ڈھالا۔ دینی آثار وشعائر کو بالشویک (یہ کمیونزم کا روسی نام ہے۔ بالشویک پارٹی کا مقصد کارل مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں روس کے محنت کشوں کو انقلاب کے لیے منظم کرنا اور زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ کر محنت کشوں کی حکومت قائم کرنا تھا تاکہ ملک میں سرمایہ داری نظام کو ختم کرکے اشتراکی نظام رائج کیا جائے۔ 1917ء کے انقلاب روس کے بعد 'بالشویک پارٹی' کا نام روسی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) ہو گیا۔ (ڈاکٹر حسن مدنی) حکومت کی طرز پر جبری طور پر ملک وقوم سے مٹایا اور مغربی قوانین کو عملاً لاگو کیا گیا۔

مصر: مصر کا سیکولرزم برطانوی قبضے کے دوران مستحکم ہوا۔ مصر کی پہلی سیاسی جماعت حزبِ وطنی 1882ء میں قائم ہوئی جس نے لادینی طرزِ سیاست کو فروغ دیا۔ مصر میں روشن خیالی کی ترویج کے لیے استعمار نے تحریک اصلاح کی سرپرستی کی جس کے لیڈر محمد عبدہ تھے۔ محمد عبدہ کے اپنے دور کے عوام وخواص پر بڑے اثرات تھے۔ اس نے مغربی قوانین سے اخذ و استفادہ کو مسلم عقلیت کے لیے قابل قبول بنایا۔ اس کے بعد سیکولرزم کے داعیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ عبدالرحمن کواکبی نے 1902ء میں دین وسیاست کو الگ کرنے کی دعوت دی۔ شریعت پر حملے کیے اور سود کو حلال قرار دیا۔ علی عبدالرزاق نے اسلام کو محض روحانی مذہب قرار دیا۔ عبدالمتعال نے حدودِ الٰہی کو غیر واجب قرار دیا۔

تعلیم و تربیت:

مسلمانوں کے آخری اَدوار میں مسلمانوں کا نظام تعلیم اسلام کی فرد و معاشرہ پر مشتمل جامع روح کا عکاس نہ تھا۔ اُس پر جمود طاری تھا اور وہ زمانے کے مسائل کی وضاحت نہ کر رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ نظام تعلیم عملیت سے عاری، تاثیر سے منقطع اور معاشرے کی تشکیل سے غیر متعلق تھا۔ اُمّت مسلمہ میں جدید مغربی علوم کا دُخول استعمار کے زیر سایہ ہوا۔ مغربی ممالک نے اسلامی ممالک پر قبضہ کرتے ہی ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اُس وقت سے عالم اسلام میں علم کی دوئی پیدا ہوئی۔ یعنی

1۔ دینی تعلیم جو محدود اور تنگ ہونے کے ناطے شریعت کی حدود میں غور وفکر اور درپیش مسائل کی طرف متوجہ نہ تھی۔

2۔ جدید تعلیم جو لادین اور غوروفکر کی تمام سرگرمیوں پر مشتمل تھی۔

قدیم دینی نظام تعلیم اپنے اہداف، طریق کار، اسلوب تدریس اور وسائل میں پس ماندہ تھا جبکہ جدید سکولوں کالجوں کا نظام تعلیم استعمار کے زیر سایہ اپنے وسائل اور مظاہر میں نہایت عالی شان تھا۔ لارڈ میکالے نے ہندوستان میں جدید تعلیم کا جو ہدف بیان کیا، وہی ہدف بیروت، استنبول، قاہرہ وغیرہ میں اپنایا گیا۔ یعنی کلرکوں کی ایسی نسل تیار کرنا جو استعمار کی نوکری کرکے فخر کرے اور اپنے قومی سرمایہ افتخار کو بھول جائے۔ مسلمان طلبا کے طائفے یورپ روانہ ہوئے

جنھوں نے واپس آکر اپنی قوم میں بدیسی عظمت کے بیج بوئے۔ جدید تعلیم کے ذریعے مسلمان نسلوں میں اسلام اور اُس کی تاریخ وتہذیب کے متعلق مہلک شکوک اور اعتراضات پیدا کیے گئے۔ مغربی علوم کے تراجم میں عملی وتطبیقی علوم کو نظر انداز کر کے عشق ومحبت کے قصوں کی بھرمار کی گئی۔ مغربی تہذیب کو سوچے سمجھے اور بلا تمیز اپنانے کی دعوت پیش کرنے والے طٰہٰ حسین، احمد لطفی، اسماعیل مظہر اور قاسم امین تھے جن کی طرزِ فکر مکمل طور پر مغربی تھی۔ جدید تعلیم کی وجہ سے نئی نسل لادین تربیت کی حامل ہوئی۔ قدیم دینی نظام تعلیم کو بتدریج مغربی اغراض کے ماتحت کیا گیا۔ فصیح عربی زبان کو ترک کر کے لغتِ عامی کو ترویج دی گئی تاکہ قرآن کی زبان متروک ہوجائے۔ جدید یونیورسٹیوں میں مغربی علوم کو لادین منہج کے مطابق پڑھایا گیا۔ مردوزن کا اختلاط، رقص ڈرامے اور موسیقی کی تعلیم، جدید علوم کے الحادی نظریات، مغربی ادبی وتاریخی مکاتب فکر کی ترویج، جدید نظام تعلیم کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ شعراء، ادبا، مفکرین اور میڈیا کے افراد پر مغربی علوم کا غلبہ عام ہوگیا۔ ہر طرف اباحیت، عقلیت، رومانیت، واقعیت، مارکسیت، ڈارونیت اور لامعقولیت وغیرہ کے اثرات غالب آگئے۔

معاشرت واخلاق: مسلمانوں کے دور انحطاط میں اُن کی معاشرتی زندگی خالص اسلامی تعلیمات کی عکاس نہ تھی بلکہ اُس پر جاہلی رسوم ورواج اور ادنیٰ جذبات کا غلبہ ہو چکا تھا۔ جب مسلمانوں پر مغرب کا عسکری وسیاسی غلبہ ہوا تو وہ مغربی معاشرت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مسلمان دین کی سند پر اپنی حیا اور عزت وناموس کی حفاظت کرتے تھے پھر بھی پس ماندہ تھے جبکہ مغرب بے حیائی، اختلاط اور بے پردگی کے باوجود ترقی یافتہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں یہ عقلیت پیدا کی گئی کہ پس ماندگی کا سبب اسلام اور ناقص مشرقی معاشرت ہے۔

محمد علی مصری کے دور میں مسلم طلبا کے طائفے یورپی ممالک سے کھیپ در کھیپ پڑھ کر آئے۔ انھوں نے اسلامی معاشرت اور مغربی معاشرت کا فرق کھول کھول کر بیان کیا اور مغربی طور طریقوں کو افضل قرار دیا۔ عالم اسلام میں نسوانی قضیے کی ابتدا جمال الدین افغانی سے ہوئی جس کے نزدیک مشرق کی خرابیوں کی جڑ عورت ومرد کو مساوی نہ سمجھنا تھا۔ محمد عبدہ اور قاسم امین افغانی کے شاگرد تھے۔ قاسم امین نے 1897ء میں عورت کے اسلامی تصورات پر خطرناک ترین حملے کیے۔ اُس نے حجاب کو رذیل ترین اخلاق کا سبب قرار دیا اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ باور کرایا۔ قاسم کے نزدیک مسلمانوں کے مرض کا علاج یہ ہے کہ اُن کی تربیت مغربی طریقے پر کی جائے۔ 1919ء میں مصر کا استعمار کے خلاف انقلابی ماحول پیدا ہوا تو اس میں عورتوں نے احتجاجی سیاست کا بھرپور مظاہرہ کیا جس سے اُن کی لادین حقوق کی سیاست خوب مقبول ہوئی۔

بیدارئ نسواں کی اوّلین تحریک کی قیادت ہدی الشعراوی نے کی جس کا سرپرست سعد زغلول تھا۔ 1945ء کی مصری نسوانی تحریکوں کی رسوائیوں کو مصری اخبارات نے خود نشر کیا۔ یہ تنظیمیں مغرب سے مال وصول کرتیں اور مسلمانوں میں بے حیائی پھیلاتیں۔ جدید مصری صحافت نے مغربی فیشن اور مغربی نسوانیت کو فروغ دینے میں بھرپور حصہ لیا۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کو طلبا کے احتجاج کے باوجود غالب کیا گیا۔ اسماعیل مظہر نے عورت کی گھرداری کو فرسودہ ناقص اور غیر اسلامی نظام قرار دیا۔ عورت کی وراثت، گواہی اور ملازمت کے حقوق وغیرہ کو مرد کے برابر قرار دیا۔ خالد محمد خالد نے تعدد ازواج اور خاوند کے اسلامی حق طلاق پر پابندی کا مطالبہ کیا۔

اس طرح عالم اسلام میں بتدریج اخلاقی بے راہ روی پروان چڑھ گئی۔ ترکی میں مختصر لباس اور اعلانیہ بوس وکنار عام ہوا۔ افریقہ، الجزائر، تیونس وغیرہ میں فحاشی استعمار سے آزادی کے بعد زیادہ بڑھ گئی۔ الیکٹرونک میڈیا، اخبارات ورسائل اور سائن بورڈ نے فحاشی کے فروغ میں خوب حصہ لیا۔ ہر طرف مخلوط تعلیم، مخلوط سرکاری ادارے، گھر بازار اور عوامی مقامات پر مردوزن کی بے حجاب معاشرت پھیل گئی۔ نتیجہ میں معاشرتی جرائم، قتل، لوٹ مار، آوارہ گردی، گھروں کا ٹوٹنا، غیر محفوظ نسل اور خاندانوں کا بکھرنا بھی عام ہوگیا۔ عالم اسلام میں ابھی بھی بے پردگی کو ترقی اور خوش حالی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کیا عالم اسلام میں سیکولرزم کے وہ اسباب موجود ہیں جو یورپ میں تھے!

یورپ کا سیکولرزم تحریف شدہ مسیحیت سے پیدا ہوا۔ غیر عقلی اور غیر فطری نظریۂ تثلیث، اناجیل کی تحریف، خدائی حقوق پر مبنی پاپائیت، موروثی گناہ کا غیر عقلی تصور، بخشش کے سرٹیفکیٹ جو ادیان کی تاریخ کی بدترین بدعت تھی۔ یہ وہ اُمور تھے جن کی وجہ سے یورپ کے خواص وعوام دین سے متنفر ہوئے اور انھوں نے قدیم یونانی ورومی علوم وآداب کا احیا کیا اور زندگی کی بنیاد وحی الٰہی کو چھوڑ کر فلسفے پر قائم کی۔

اسلام کو یورپ کے دین مسیحیت جیسے حالات پیش نہ آئے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید سادہ اور فطری ہے۔ قرآن اللہ کا محفوظ کلام ہے، محمدی شریعت زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اسلام نبوی دور میں ہی شریعت الٰہی پر مبنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا جبکہ مسیحیت ایسا نہ کرسکی۔ اسلام کے علما کے لیے پاپائیت جیسے اختیارات بھی نہیں اور اُن جیسا جبر واستبداد بھی نہیں۔ اسلام میں باطل فرقے پیدا ہوئے لیکن وہ اسلام کی سنّی تشریح پر غالب نہیں آسکے جبکہ مسیحیت کا حقیقی دین شروع میں ہی مغلوب ہوگیا۔ اسلام میں مسیحیت کی طرح مذہبی پیشوائیت نہیں جو عوام اور اللہ کی عبادت کے درمیان واسطہ ہو بلکہ یہاں ہر شخص براہ راست اللہ سے تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اسلام میں کبھی بخشش کے سرٹیفکیٹ تقسیم نہیں ہوئے اور نہ بندوں کے سامنے اقرارِ گناہ کی رسم موجود رہی۔ اسلام نے کلیسا کی طرح دینی پیشواؤں کی تنظیم نہیں بنائی جو عوام کا فکری، معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کرے۔ اسلام نے مسیحیت کی طرح علوم کی دینی ودنیاوی تقسیم نہیں کی اور نہ رہبانیت کی

اجازت دی۔ اسلام کے نزدیک اللہ نے آدم کا گناہ معاف کردیا تھا اور اُن کا گناہ ان کی اولاد میں منتقل نہیں ہوا۔ اسلام میں کسی سطح پر واسطوں کا شرک پیدا ہوا لیکن علمائے اسلام نے اُس کے خلاف آواز اٹھائی اور حقیقتِ توحید کو گم ہونے سے محفوظ کیا۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو ویسے حالات پیش نہیں آئے جیسے یورپ کو پیش آئے۔ لہٰذا اسلام کو سیکولرزم قبول کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسلام میں سیکولرزم کا حکم

سیکولرزم دو اعتبار سے اسلام کے منافی ہے:

1۔ سیکولرزم تصور عبادت کے منافی ہے: عبادت اللہ کی کلی فرماں برداری اور مکمل زندگی رب کے حضور پیش کرنے کا نام ہے۔ سیکولر انسان اپنی فرماں برداری کے ٹکڑے کرتا ہے اور کچھ حصہ اللہ کے لیے مختص کرتا ہے اور کچھ حصہ غیر اللہ کے لیے بجا لاتا ہے۔ اسلام میں دنیا و آخرت کی سرگرمیاں ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے وہ عبادت ہے، چاہے وہ کاروبار ہو یا سیاست، فن وادب ہو یا تعلیم و تربیت، گھر بار ہو یا وطن و قوم کی خدمت۔

سیکولرزم غیر اللہ کی فرماں برداری کو بھی روا سمجھتا ہے۔ غیر اللہ کی فرماں برداری کو جائز سمجھنا، اُس کی غیر مشروط اطاعت کو لازم ماننا، اُس کے احکامات اور قوانین کو دین سے زیادہ قابل قدر سمجھنا... یہ تمام امور نصوص شرعیہ کے مطابق کفر اکبر ہیں۔

2۔ سیکولرزم 'حکم بغیر ما انزل اللہ' ہے: یعنی اس میں اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق انفرادی یا اجتماعی فیصلے نہیں ہوتے۔ یہ چیز فقط گناہ ہی نہیں بلکہ شرک ہے۔ جب کوئی شخص زندگی کے کسی شعبے میں شریعت کی اتباع کو لازم نہ سمجھے یا اللہ کے حکم کی تنفیذ کو واجب قرار نہ دے تو وہ بالاتفاق دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ غیر اسلام کو قانون سمجھنا شرک ہے جیسا کہ قرآن وحدیث کی کئی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ اور قرآن وسنت سے خود ساختہ غیر معصوم قوانین کو دستوری حیثیت دینا گناہ ہے، جس کے نتیجے میں مسلم ممالک میں دسیوں شرعی اور متصادم قوانین متعارف ہو سکتے ہیں۔

3۔ سیکولرزم اپنی فکر کے اعتبار سے ادیان کو برحق نہیں سمجھتا:

سیکولر لوگ خدا کے وجود کے اقرار کے باوجود دین اور وحی کو حجت نہیں سمجھتے اور نہ ہی اِس کی اتباع کو لازم قرار دیتے ہیں۔ سیکولرزم کا اخلاق فواحش، مادیت، اباحیت، دینی و سماجی روایات سے انحراف اور نفسانی خواہشات پر مبنی ہوتا ہے۔ سیکولرزم کا قانون اور نظام دین سے علیحدگی پر مشتمل ہوتا ہے۔ دین کو چند انفرادی رسوم میں محدود کر کے زندگی کے باقی تمام اجتماعی شعبے دین سے آزاد کیے جاتے ہیں۔

سیکولرزم کی فکر، اخلاق اور قانون تینوں اسلام کی عبدیت کے منافی ہیں۔ انسان اپنی فکر، اخلاق اور قانون میں اللہ کا عبد ہے اور اُس کی رضا کا پابند، وہ آزاد مخلوق نہیں۔

☆ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سیکولرزم کفر و شرک نہیں کیونکہ اس کے ماننے والے اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ اُن کی بات کئی اعتبار سے غلط ہے:

1۔ قریش مکہ اللہ کا اقرار کرتے تھے اور نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کے ساتھ شرک بھی کرتے تھے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے اُن کے ساتھ ۱۳ سال تبلیغی جدوجہد کی اور دس سال جہاد کیا۔

2۔ علمائے دین نے اسلام کو توڑ دینے والے اُمور بتلائے ہیں جن کا ارتکاب کرنے سے کلمہ پڑھنا اور نمازیں ادا کرنا بے معنیٰ ہو جاتا ہے اور انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اُن کو نواقض اسلام کہتے ہیں۔ سیکولرزم کو برحق جاننا ناقض اسلام ہے۔ اس کی موجودگی میں اللہ پر ایمان اور نماز کی ادائیگی معتبر قرار نہیں پاتی۔

سیکولر لوگ اللہ کی عبادت کے معنی و مفہوم کو نہایت محدود قرار دیتے ہیں اور یہ بات قابل تعجب نہیں۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ دورِ جاہلیت میں عبادت کو محدود سمجھتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے اُن کو بتلایا کہ اللہ کے مقابلے میں کسی کے امر و نہی کو تسلیم کرنا، اُس کی عبادت کرنا ہے۔

سیکولرزم توحید الٰہی میں شرک ہے، وہ نبوت کے خلاف بغاوت ہے، وہ غیر اللہ کی حاکمیت کو جائز سمجھنا ہے۔ وہ اسلام کی اصل کے منافی ہے۔ وہ طاغوت کی عبادت ہے۔ سیکولرزم جاہلیت کا فروغ اور خواہش نفس کی عبودیت ہے۔ سیکولرزم فساد فی الارض ہے!!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی تبدیل ہوتی رہتی ہے جبکہ شریعت کے احکام ٹھوس اور جامد ہیں، یہ زندگی کے تمام مسائل حل نہیں کرسکتی۔ یہ بات بھی بالکل باطل ہے۔ اسلام زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور قیامت تک انسان کی راہنمائی کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کے ذریعے معاشرے کی فلاح کا راستہ واضح کیا ہے۔ علوم نبوت کے حامل علمائے کرام کو معاشرے کے ہر زندہ مسئلہ پر اسلامی رہنمائی کی بھرپور تیاری کرنی چاہیئے، جیسے فلسفہ یونان کے دور میں علمائے حقہ نے ہر انحراف کا کافی وشافی جواب دیا تھا۔ قرآن وسنت کے معانی ومفاہیم میں درک وبصیرت حاصل کیا جائے، ہر سوال کی کافی وضاحت یہاں سے مل سکتی ہے، یہی وہ چشمہ صافی ہے جس سے فیض پاکر شمع نبوت کے پروانے جاہلیت قدیمہ اور وقت کی سپر پاورز کو اللہ کے جھنڈے تلے لائے، اور اسی سے جاہلیتِ جدیدہ کے تاروپود بکھریں گے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن وسنت کو سیکھیں اور پڑھیں، وہ معتبر ومستند علمائے دین سے سوال کریں، اور جب رہنمائی مل جائے تو اس پر خلوص دل سے عمل کریں تو کفر کی یہ ظلمتیں چھٹ جائیں گی اور اسلام کا نور دنیا پر غالب آجائے گا اور اس کا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے وعدہ کر رکھا ہے۔

☆☆☆

غلاموں کے ساتھ اچھا رویہ

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ إِلٰى قَوْلِهٖ: ﴿وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ [النساء:٣٦]

"والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔۔۔اور ۔۔۔اپنے زیرِملکیت لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔"

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

كَانَ آخِرُ كَلَامِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: «الصَّلَاةَ الصَّلَاةَ، اتَّقُوا اللّٰهَ فِيمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ.» (سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك: 5156، سنن ابن ماجه، كتاب الوصايا، باب هل أوصى رسول الله ﷺ: 2698)

"رسول اللہ ﷺ کی آخری کلام یہ تھی: نماز، نماز، (اور) اپنے زیرِملکیت لوگوں (یعنی غلاموں اور لونڈیوں) کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔"

سیدہ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں فرمایا:

«اللّٰهُ، اللّٰهُ، الصَّلَاةَ، وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ». فَمَا زَالَ يَقُولُهَا، حَتّٰى مَا يَفِيضُ بِهَا لِسَانُهُ.(سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ذكر مرض رسول الله ﷺ:1625، مسند أحمد:290/6)

"اللہ، اللہ، نماز کا اہتمام کرنا اور اپنے زیرِ ملکیت لوگوں کا خیال رکھنا، آپ ﷺ مسلسل یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک رُک گئی۔"

گویا آپ ﷺ نے بہ وقتِ رحلت بھی جن اہم امور کے اہتمام کی بہ طورِ خاص وصیّت فرمائی ان میں سے ایک امر غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔

معرور بن سوید بیان کرتے ہیں کہ:

رَأَيْتُ أَبَا ذَرٍّ الْغِفَارِيَّ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلٰى غُلَامِهٖ حُلَّةٌ، فَسَأَلْنَاهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ: إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَشَكَانِي إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهٖ؟». قُلْتُ: نَعَمْ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ إِخْوَانَكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللّٰهُ أَيْدِيَكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَأَعِينُوهُمْ عَلَيْهِ.» (صحيح بخاري، كتاب الإيمان، باب المعاصي من أمر الجاهلية، ولا يكفر صاحبها بارتكابها إلا بالشرك:30، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب إطعام المملوك مما يأكل ... :1661)

"میں نے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایک عمدہ پوشاک پہنے ہوئے ہیں اور ان کے غلام نے بھی ایک عمدہ پوشاک پہنی ہوئی ہے، تو میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ایک مرتبہ ایک شخص سے میری گالم گلوچ ہو گئی، اس نے رسول اللہ ﷺ کو میری شکایت کر دی، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کیا تم نے اسے اس کی ماں کی عار دِلائی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً تمہارے غلام بھی تمہارے بھائی ہیں، اگرچہ انہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری ماتحتی میں دے رکھا ہے، سو جس شخص کا بھی بھائی اس کے ماتحت ہو اسے اس کو بھی وہی کچھ کھلانا چاہیے جو وہ خود کھائے اور اسے بھی وہی پہنائے جو وہ خود پہنے اور ان کی طاقت سے زیادہ تم انہیں تکلیف مت دو اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ لادو بھی تو اس کام میں ان کی مدد کرو۔"

جس شخص کے ساتھ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ پیش آیا تھا وہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ تھے اور گالی گلوچ سے مراد لڑائی جھگڑے میں اُونچ نیچ ہو جانا یا بُرا بھلا کہنا مراد ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ چونکہ غلام تھے اس لیے نبی ﷺ نے اس کا ذمہ دار سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو ٹھہرایا اور تمام مسلمانوں کے لیے یہ حکم جاری فرمایا کہ غلاموں کے ساتھ امتیازی سلوک کی بجائے انہیں مساویانہ حقوق دِیے جائیں اور انہیں بھی ان سب سہولیات سے نوازا جائے جو اپنے لیے ہوں۔

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَاءَمَكُمْ مِنْ مَمْلُوكِيكُمْ فَأَطْعِمُوهُ مِمَّا تَأْكُلُونَ، وَاكْسُوهُ مِمَّا تَلْبَسُونَ، وَمَنْ لَمْ يُلَائِمْكُمْ مِنْهُمْ فَبِيعُوهُ، وَلَا تُعَذِّبُوا خَلْقَ اللّٰهِ»(سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك:5161، مسند أحمد:158/5)

"تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو تمہارے موافق ہوں انہیں بھی تم وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور جو ان میں سے تمہارے موافق نہ ہوں تو انہیں بیچ دو، اور اللہ کی مخلوق کو عذاب مت دو۔"

موافق ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری خدمت کرتے ہوں، اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرتے ہوں اور تابع فرمانی بجالاتے ہوں، اگر وہ یہ سب کرتے ہوں تو پھر انہیں اپنے جیسا کھلاؤ پلاؤ اور لباس پہناؤ اور ساتھ ہی فرمادیا کہ اگر وہ یہ سب نہ کرتے ہوں تو پھر انہیں سزائیں نہ دو یا ان کے حقوق سلب نہ کرو بلکہ ان کا حل یہ ہے کہ انہیں کسی اور کو بیچ دو مگر ان پر ظلم ہرگز نہ کرو۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ بِالْمَعْرُوفِ، وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ مَا لَا يُطِيقُ.»

(صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب إطعام المملوك مما يأكل، وإلباسه مما يلبس، ولا يكلفه ما يغلبه: 1662)

"غلام کو اچھے طریقے سے کھانا اور لباس مہیا کیا جائے اور اسے اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی کام کی تکلیف نہ دی جائے۔"

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا صَنَعَ خَادِمُ أَحَدِكُمْ لَهُ طَعَامًا فَجَاءَ بِهِ وَقَدْ وَلِيَ حَرَّهُ وَدُخَانَهُ، فَلْيُقْعِدْهُ مَعَهُ لِيَأْكُلَ، فَإِنْ كَانَ الطَّعَامُ مَشْفُوهًا، فَلْيَضَعْ فِي يَدِهِ أُكْلَةً أَوْ أُكْلَتَيْنِ»(صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب إطعام المملوك مما يأكل، وإلباسه مما يلبس، ولا يكلفه ما يغلبه: 1663، سنن أبوداؤد، كتاب الأطعمة، باب في الخادم يأكل مع المولى: 3846)

"جب تم میں سے کسی شخص کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کر کے اسے پیش کرے اور (چونکہ) اس نے (تیار کرتے وقت) اس کی گرمی اور دھواں برداشت کیا ہوتا ہے (اس لیے) اسے (یعنی اس کے مالک کو) چاہیے کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائے، لیکن اگر کھانا کم ہو اور کھانے والے زیادہ ہوں تو پھر بھی ایک یا دو لقمے اس کے ہاتھ پہ رکھ دینے چاہییں۔"

افضل تو یہ ہے کہ اپنے غلام یا خادم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا جائے لیکن اگر کسی وجہ سے اسے ساتھ بٹھانا ممکن نہ ہو تو پھر کھانے میں سے کچھ نہ کچھ، خواہ ایک یا دو لقمے ہی ہوں، اس کو تھما دینے چاہییں تاکہ اس نے جو کھانا پکاتے ہوئے آگ کی تپش برداشت کی ہے اس کا تھوڑا سا صلہ مل جائے۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

كُنْتُ أَضْرِبُ غُلَامًا لِي فَسَمِعْتُ صَوْتًا: «اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ، اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ، اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ، اللهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ». فَالْتَفَتُّ فَإِذَا هُوَ النَّبِيُّ ﷺ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! هُوَ حُرٌّ لِوَجْهِ اللهِ تَعَالَى، قَالَ: «أَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْكَ النَّارُ.»

(صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب صحبة المماليك، وكفارة من لطم عبده: 1659، سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك: 5159، سنن ترمذی، أبواب البر والصلة، باب النهي عن ضرب الخدم وشتمهم: 1948)

"میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ میں نے ایک آواز سنی: اے ابو مسعود! یاد رکھ، ابو مسعود! یاد رکھ، ابو مسعود! یاد رکھ کہ تیری اس پر قدرت سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ تجھ پر قادر ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے (اسی وقت) کہا: اے اللہ کے رسول! یہ رضائے الٰہی کیلئے آزاد ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو! اگر تم یہ نہ کرتے تو آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔"

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَطَمَ مَمْلُوكَهُ، أَوْ ضَرَبَهُ، فَكَفَّارَتُهُ أَنْ يُعْتِقَهُ.»(صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب صحبة المماليك، وكفارة من لطم عبده: 1657)

"جس نے اپنے غلام یا لونڈی کو تھپڑ لگایا یا اسے مارا، تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔"

گویا غلام کو مارنا اس قدر بڑا جرم ہے کہ اس کا کفارہ اس غلام کی آزادی ہے، یعنی اسے آزاد کر کے ہی وہ اس گناہ سے بری ہو سکتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَذَفَ مَمْلُوكَهُ بِالزِّنَا، أُقِيمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِلَّا أَنْ يَكُونَ كَمَا قَالَ»

(صحيح بخاری، كتاب المحاربين، باب قذف العبيد: 6858، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب التغليظ على من قذف مملوكه بالزنا: 1660)

"جس نے اپنے غلام یا لونڈی پر زنا کی تہمت لگائی تو اس پر روزِ قیامت (تہمت کی) حد لگائی جائے گی، سوائے اس کے کہ وہ اسی طرح ہو جیسے اس نے کہا۔"

یعنی اگر اس کا غلام یا لونڈی حقیقتاً ویسا ہی ہو جیسا اس نے کہا ہو تو اس صورت میں معافی ہو سکتی ہے وگرنہ روزِ قیامت اسے اس تہمت کی سزا میں حد لگائی جائے گی۔

سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

كَمْ تَعْفُو عَنِ الْخَادِمِ؟ قَالَ: «أَعْفُو عَنْهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِينَ مَرَّةً.»(سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك: 5164، سنن ترمذی، أبواب البر والصلة: 1949)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم خادم سے کتنی مرتبہ درگزر کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس سے ہر روز 70 مرتبہ درگزر کرتا ہوں۔"

اگر خادم یا نوکر ایک دن میں 7 مرتبہ بھی غلطی کرتا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق اسے

سترّ بار ہی معاف کر دیا جائے، گویا اس کے بار بار غلطی کرنے پر اسے شائستگی اور نرمی سے سمجھایا تو جاسکتا ہے مگر زدوکوب نہیں کیا جاسکتا۔

جب خادم حُسنِ عمل کا مظاہرہ کرے

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْمَمْلُوكُ الَّذِي يُحْسِنُ عِبَادَةَ رَبِّهِ، وَيُؤَدِّي إِلَى سَيِّدِهِ الَّذِي لَهُ عَلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ وَالنَّصِيحَةِ وَالطَّاعَةِ لَهُ أَجْرَانِ: أَجْرُ مَا أَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهِ، وَأَجْرُ مَا أَدَّى إِلَى مَلِيكِهِ الَّذِي عَلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ.» (صحيح بخاری، كتاب العتق، باب كراهية التطاول على الرقيق، وقوله: عبدي أو أمتي: 2551)

"وہ غلام جو اچھے طریقے سے اپنے رب کی عبادت کرتا ہے اور اس پر اس کے مالک کے جو خیر خواہی اور فرمانبرداری کے حقوق ہیں انہیں بھی بہ طریقِ احسن ادا کرتا ہے تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے، ایک اجر اپنے رب کی اچھے طریقے سے عبادت کرنے کا اور دوسرا اجر اپنے اوپر عائد ہونے والے اپنے آقا کے حقوق کی ادائیگی کا۔"

لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے مالک یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو پھر وہ اس فضیلت کا حق دار نہیں بلکہ اس کے برعکس گناہ کا سزاوار ٹھہرے گا۔

سیدنا ابوبردہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلَاثَةٌ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ: رَجُلٌ آمَنَ بِالْكِتَابِ الْأَوَّلِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَرَجُلٌ كَانَتْ لَهُ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ أَدَبَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا، وَعَبْدٌ أَدَّى حَقَّ اللهِ تَعَالَى وَحَقَّ مَوَالِيهِ.» (صحيح بخاری، كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته وأهله: 97، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد ﷺ ...: 154)

"تین لوگ ایسے ہیں جنہیں دوہرے اجر سے نوازا جائے گا: (ایک) وہ بندہ جو پہلی کتاب پر بھی ایمان لایا اور اس پر بھی جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی گئی، (دوسرا) وہ شخص جس کی ملکیت میں لونڈی تھی، اس نے اس کی اچھے انداز میں تربیت کی پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی اور (تیسرا) وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے مالکوں کا حق بھی ادا کرتا ہے۔"

زیرِ نگیں لوگوں کے بارے میں مسؤلیت

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَا إِنَّ كُلَّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ: فَالْأَمِيرُ رَاعٍ عَلَى النَّاسِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ، وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَامْرَأَةُ الرَّجُلِ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ، وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ، وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ، وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ، أَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.» (صحيح بخاری، كتاب الأحكام، باب قول الله تعالى: ﴿وَأطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم﴾: 7137، صحيح مسلم، كتاب الأمارة، باب فضيلة الإمام العادل: 1829)

"سنو! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کے زیرِ نگیں لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، امیر (حکمران) لوگوں پر نگران ہے اور اس سے اپنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، آدمی اپنے گھر والوں پر نگران ہے اور اس سے اپنے زیرِ نگیں لوگوں کے بابت سوال ہوگا، آدمی کی بیوی اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران ہے اور اس سے ان کے بابت پوچھا جائے گا اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال پر نگران ہے اور اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا، سنو! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک اپنے زیرِ نگیں کے بارے میں مسؤل ہے۔"

دنیا میں آنے والا ہر شخص کسی نہ کسی فرد یا اَفراد کا نگران ہے اور اس سے اس کے زیرِ نگیں لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ تمہاری نگرانی میں فلاں فلاں لوگ تھے، تم پر ان کی ذِمہ داری عائد تھی تو تم نے وہ کس قدر نبھائی ہے؟ وہ اللہ و رسول کے فلاں فلاں حکم سے سرتابی کیا کرتے تھے تو تم نے انہیں کیوں نہیں سمجھایا؟ ان کی خبر کیوں نہیں لی؟ جاننے کے باوجود بھی ان سے اللہ و رسول کی نافرمانی ترک کروا کر ان کے احکام کی بجا آوری کا انہیں پابند کیوں نہیں بنایا؟ چنانچہ وہ رب کے حضور اپنے علاوہ اپنے زیرِ نگرانی لوگوں کے بابت بھی جوابدہ ہوگا۔ اس لیے ہر شخص کو اس ذِمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑنا چاہیے تاکہ کل روزِ قیامت رب تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے معاملے کو آسان بنایا جاسکے۔

کسی نوکر کو اس کے مالک کے خلاف بھڑکانے کا گناہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ خَبَّبَ خَادِمًا عَلَى أَهْلِهِ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ أَفْسَدَ امْرَأَةً عَلَى زَوْجِهَا فَلَيْسَ مِنَّا.» (السنن الكبرى للبيهقي: 13/8، مسند أحمد: 397/2، سلسلة الأحاديث الصحيحة: 324)

"جس نے کسی نوکر کو اس کے مالک کے خلاف بھڑکایا وہ ہم میں سے نہیں، اور جس نے کسی عورت کا اس کے خاوند کے خلاف ذہن بگاڑا وہ بھی ہم میں سے نہیں۔"

نوکر کو مالک کے خلاف اور بیوی کو اس کے خاوند کے خلاف بھڑکانا بہت بڑے فساد کا باعث بنتا ہے، اس کی قباحت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے عمل بد کے مرتکب کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے کہ ایسا شخص ہمارے طریقے اور راستے پر نہیں ہے۔

☆☆☆

ساری کائنات میں سب سے بڑا سخی خود اس کائنات کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ کی مقدس ذات ہے جو "رحمن ورحیم" کی حیثیت سے اپنے کرم کی بارش فرماتے رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نبی پاک ﷺ کی سیرت طیبہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اولادِ آدم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد جود و سخاوت میں سب سے بڑھ کر آقائے نامدار محمد مصطفی ﷺ کی ذات گرامی بابرکت ہے۔ لیکن اشاعت علم دین کی جدوجہد میں مصروف رہنے والے بھی اس امتیازی خصوصیت "جود و سخاوت" کے عالی شان مرتبہ سے خالی نہیں ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مومن اپنے لئے جو چیز پسند کرتا ہے وہ دوسرے اپنے بھائیوں کے لئے بھی وہی چیز پسند کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ سے ایک ایمان والا بندہ جب وہ علم دین سیکھتا ہے تو وہ دیگر بھائیوں کے لئے بھی علم سکھانے کو پسند کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل نبی پاک ﷺ کی نگاہِ مبارکہ میں صدقہ ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت یوں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "افضل صدقہ یہ ہے کہ ایک مسلم شخص علم سیکھ کر اپنے دوسرے مسلم بھائی کو اس کی تعلیم دے۔" (سنن ابن ماجہ شریف) مال دولت ہی میں سے ادا نہیں کئے جاتے بلکہ علم و حکمت جو اللہ ہی کی عطا کی ہوئی دولت ہوتی ہے، دوسروں تک اسے منتقل کرنا بھی ایک عظیم صدقہ ہے۔ اس طرح اللہ کی خوشنودی کے لئے علم وحکمت کی باتیں لوگوں کو بتانا اور انہیں علم سے آراستہ کرنا خدائے تعالیٰ اور رسول برحق ﷺ کی نگاہ میں بڑی قدر و منزلت کا باعث ہے۔ اسلام میں حصول علم کا مقصد نوع انسانی کا ارتقاء ہے نا کہ کسی پر فخر کرنے یا دنیا میں اپنے علم کے زور پر دوسروں کو نیچا کرنا ہوتا ہے۔

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء پر فخر کرے یا جاہلوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، خدا اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کرے گا۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہی علم انسان کو نفع پہنچائے گا اور عنداللہ مقبول ہو گا جس کے پیچھے اخلاص وللّٰہیت کارفرما ہو اور خوشنودیٔ رب کے تحت دیگر بندوں کو پہنچایا جائے۔ نام و نمود یا دنیوی مفاد سے بالاتر ہو کر علم دین اور تفقہ دین حاصل کرتے ہوئے اشاعت دین کی جدوجہد میں لگ جانا صرف صدقہ ہی نہیں بلکہ بہترین جود و سخاوت بھی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں امیر ترین لوگوں کا درجہ حاصل ہو گا۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم جانتے ہو کہ سخاوت میں کون سب سے بڑھ کر ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور رسول خوب جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جود و سخاوت میں سب سے بڑھ کر خدا ہے، پھر بنی آدم میں سب سے زیادہ سخی میں ہوں اور میرے بعد جود و سخاوت میں سب سے بڑھ کر وہ ہے جس نے علم حاصل کیا اور اس کو پھیلایا۔ یہ شخص قیامت کے روز ایک امیر کی طرح سے آئے گا یا آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک جماعت کی حیثیت سے آئے گا۔ (مسند بیہقی)

دنیا میں جتنی بھی چیزیں پائی جاتی ہیں ان میں سوائے ذکر اللہ اور اس سے متعلقہ چیزوں اور عالم دین وطالب دین کے، سب کے سب رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ملعون ہے۔

اس سلسلہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ الدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَلْعُوْنٌ مَافِیْھَا اِلَّا ذِکْرَ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ وَ عَالِمًا وَ مُتَعَلِّمًا (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، بیہقی)

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جو چیز اور جو بھی عمل جس کا تعلق اللہ کی خوشنودی ورضا سے خالی ہو وہ اصلاً قابل ترک ہے اور جو کام بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کو راضی کرنے والا اور اس کے احکام کے عین مطابق کیا جانے والا ہو گا وہ ذکر اللہ کی فہرست میں شمار ہو گا۔ اسی طرح اشاعت دین کا کام بھی یقینی طور پر ذکر الٰہی میں داخل ہے۔ خواہ کوئی دین سیکھا رہا ہو یا کوئی اسے سیکھ رہا ہو یا پھر اسے کوئی دنیا میں پھیلا رہا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہل علم کیلئے لمحۂ فکر ہے کہ جس طرح علم حاصل کر کے اس کی اشاعت کے لئے ہمیشہ تیار رہنا اور اس کی ترویج میں کوشاں ہونا جہاں سخاوت کے اونچے مقام تک پہنچا دیتا ہے وہیں پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اشاعت علم دین سے غفلت برتنا یا علم کو اپنی ذات کی حد تک محدود کر کے رکھ دینا بھی بڑی محرومی اور بخالت ہے اور بخل ایک ایسی بیماری ہے جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور بخیل آدمی سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض رہتا

ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو چھپائے تو قیامت کے دن اس کے (منہ میں) آگ کی لگام دی جائے گی۔“(سنن ابو داؤد، جامع ترمذی)

اس طرح علم کو چھپانے والوں کو سخت وعید سنائی گئی۔ اس کے برخلاف رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے حق میں دعا فرمائی ہے جنھوں نے آپ کی بات کو سنی اور دوسروں تک پہنچایا۔ اس سلسلہ میں فرمان نبوی ﷺ یوں آیا ہے:«نَضَّرَاللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَها وَوَعٰها وَاَدّاها فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هوَ أَفْقَهُ مِنْهُ» (جامع ترمذی)

اور اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بھی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ

«بَلِّغُوْ عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً»

”میری طرف سے پہنچا دو۔“ اگرچہ ایک ہی آیت (کے بقدر تمھیں میری بات کا علم) ہو۔(صحیح بخاری)

مذکورہ دونوں احادیث شریفہ سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامی جو حقیقت میں حق تعالیٰ جل شانہ کی مرضیات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دوسروں تک اسے منتقل کرنا اور اسے پھیلانا انتہائی ضروری ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے اور اس سے بڑھا شرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بات کو پہنچانے والے نبی پاک ﷺ کی طرف سے دی جانے والی دعاؤں کے مستحق ہوتے ہیں اور جس کے حق میں نبی ﷺ دعا فرمادیں۔ اس شخص کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا، یعنی دنیا کی زندگی اور آخرت کی ابدی حیات میں رسوائی سے بچالیا جاتا۔

علم کی اشاعت وسیع پیمانے پر کرنا یہ اہل ایمان کا شیوہ ہے اور اس کے برعکس اشاعت علم کو مخصوص طبقہ تک محدود کرنا یا صرف ان ہی باتوں کا اظہار کرنا جو عوام اور برسر اقتدار لوگوں کی خوشنودی کا باعث ہوتے ہوں اور اسی طرح ان باتوں کا اخفا کرنا جس کے اظہار سے مفادات پر ضرب پڑتی ہو یہ ایسا طرز عمل ہے جس سے آدمی اہل علم ہونے کے باوجود اللہ کی نگاہ میں لعنت کا مستحق بن جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ آیت 159 میں اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾

”جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔“(ترجمانی از مولانا مودودیؒ)

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے سلسلہ میں مشہور مفسر مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے یوں تحریر فرمایا کہ

”آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے۔“(معارف القرآن:1/402-403)

اشاعت علم کے سلسلہ میں اس کے آداب کو ملحوظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے کیوں کہ جس طرح کتمان علم پر لعنت کی گئی ہے اسی طرح اللہ کی طرف سے نازل کردہ تعلیمات میں تحریف کرنا بھی بہت بڑا جرم ہے جس کا ارتکاب علماء یہود کیا کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور مفسر پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر اور جامع بات تحریر فرمائی ہے کہ

”اس آیت میں بنی اسرائیل کے ان علماء سوء کا ذکر ہے جو اپنے دنیاوی فائدہ کے لئے نبی کریم ﷺ کے کمالات کو چھپاتے اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اپنی منشاء کے مطابق توڑ موڑ دیا کرتے۔ اب بھی کوئی عالم اگر حضور کے کمالات کے اظہار میں بخل کرے اور احکام شریعت میں تحریف کرے تو اس کا یہی حکم ہے۔“(ضیاء القرآن:1/110)

مندرجہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آقائے نامدار ﷺ کی حیات طیبہ سے سیرت کے جن کمالات کا ظہور ہوا ہے چاہے وہ دعوتی پہلو سے ہو یا اخلاقی میدان ہو یا حسن معاشرت سے تعلق ہو یا خدمت خلق کا معاملہ یا پھر راہ خدا میں جدوجہد ہو یا اقامت دین کا مرحلہ غرضکہ دوستی و دشمنی کا معیار عدل وانصاف، جنگ و صلح وغیرہ میں آپ ﷺ کے کمالات واضح ہیں۔ ان تمام کمالات کا ذکر نہ کرنا کتمان علم کی تعریف میں آتا ہے اور اسی طرح شریعت اسلامی میں تحریف کرنا بھی بہت بڑا مجرمانہ عمل ہے۔

نبی ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

”جو شخص قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے اُسے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنانا چاہئے۔“

نبی ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اشاعت علم کا مرحلہ ہو یا دعوت و تبلیغ کی جدوجہد، ان سب چیزوں میں خالص کتاب و سنت سے حاصل کردہ مواد ہی پیش کیا جائے۔ اس میں کسی بھی قسم کی کوئی ملاوٹ ہونے نہ پائے اور یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کی اساس پر ہی اُمت کی اصلاح ممکن ہے۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کتمان علم کی آیت کی تشریح فرماتے ہوئے (جو اوپر گذر چکی) یوں تحریر فرمایا:”علماء یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربّیوں اور مذہبی پیشہ وروں کو ایک

محدود طبقے میں مقید کر رکھا ہے۔"
اور عامۂ خلائق تو در کنار خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لئے ہر اس ضلالت اور بدعت کو جس کا رواج ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے اپنے سکوت سے اُلٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ اس سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جارہی ہے۔ دنیا کی ہدایت کا کام جس اُمت کے سپرد کیا جائے، اس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے، نہ یہ کہ بخیل کے مال کی طرح اسے چھپائے۔ (تفہیم القرآن:ج1)

حقیقت یہ ہے کہ اگر اہل علم کتمان حق کریں یا حق پوشی کا طرز عمل اختیار کریں تو صرف ان کا ہی نقصان نہ ہوگا بلکہ یہ آگے بڑھتے بڑھتے، اس کے اثرات عوام پر بھی پڑتے ہیں اور راہِ حق کے نشانات و ہدایت کے چراغ مدھم پڑتے چلے جاتے ہیں جس سے بے حساب لوگ گمراہی اور ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں۔
الغرض اب جہاں پر علماء کرام کی یہ بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ علم دین جانتے ہیں اس کی اشاعت میں ہر وقت کوشاں رہیں، وہیں پر عوام کی بھی یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کا علم جاننے کے لئے کتاب و سنت سے اپنے تعلق کو جوڑیں اور جہاں جہاں خالص کتاب و سنت کی تعلیم دی جاتی ہو اس میں شریک ہو کر اپنے اندر بندگیٔ رب کا جذبہ پیدا کریں اور اپنے اپنے محلوں میں درس قرآن و درس حدیث کو عام کرنے کے لئے اپنے بھائیوں میں شعور بیدار کریں تاکہ قرآن حکیم کا پیغام اور نبیؐ کے ارشادات کی اشاعت عام ہو جائے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ کے دوران کوئی چیز سمجھ میں نہ آرہی ہو تو علماء کرام سے رجوع کریں تاکہ اصلاح ہو جائے۔ ہمارے اسلاف نے قرآن و حدیث کے تراجم اور اس کی تفہیم ہماری مادری زبان میں کر چکے، اس سے استفادہ کرنا خوش نصیبی ہے اور اس سے اعراض کرنا بد نصیبی و محرومی ہے۔

☆☆☆

دعا

راہِ ہدیٰ دکھلا دے مولا　　راہِ غلط سے ہٹا دے مولا
سنت کو پھیلا دے مولا　　بدعت کو دفنا دے مولا
شمع جلا ایمان کی دل میں　　کفر کی آگ بجھا دے مولا
ہم کو بنا توحید کے داعی　　دوئی اور شرک مٹا دے مولا
دنیا کی ہر خیر ہبہ کر　　دین کا علم سکھاوے مولا
حرص وہوس سے پاک ہمیں کر　　دل کو استغنا دے مولا
صحبتِ بد سے دور ہمیں رکھ　　صالح دوست بنا دے مولا
روٹھے ہوؤں کو کر دے راضی　　تو بھی اپنی رضا دے مولا
بھٹکے ہیں بدعات میں مسلم　　سنت پر وہ چلا دے مولا
ماری ہوئی تقلید وغلو کی　　امتِ وسط بنا دے مولا
کذب و دغا کا زور ہوا ہے　　مخلص ہم کو بنا دے مولا
دشمن عجم سے ہم کو بچا لے　　دشمن عرب سمجھا دے مولا
شکر کی دے توفیق زباں کو　　دل کو صدق وصفا دے مولا
دوزخ کے شعلوں سے بچا کر　　ہم کو تو فردوس عطا کر
اپنا ہی بس ڈر دے مولا　　دل میں تقویٰ بھر دے مولا
کلمہ گو بھی شرک کریں جو　　ان کو موحد کر دے مولا
روشن دل اور پاک زباں ہو　　ہم کو پاک نظر دے مولا
سچی بات ہو لب پہ ہر دم　　بات میں ایک اثر دے مولا
جیتا ہو اسلام پہ اپنا　　موت بھی ایماں پر دے مولا
ثاقب کی دن رات دعا ہے　　جنت میں اک گھر دے مولا

ڈاکٹر عبدالرب ثاقب ڈڈلی

پوپ کی شکل کا گڈا بنانا

سوال: میری ایک سہیلی ہاتھ سے گڑیاں بنانے کی ایک فیکٹری میں کام کرتی ہے، اسے نئے سال کی مناسبت سے پوپ 'نوبل' کی ہیئت سے گڈا بنانے کا کام سونپا گیا ہے، وہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا یہ کام اس کے لیے جائز ہے؟

جواب: جہاں تک بچوں کے لیے گڑیا، گڈا بنانے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر یہی کھلونا جو کہ اصلاً ایک بت کی شکل میں ہوتا ہے، مذہبی تقدس کا بھی حامل ہو تو معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔

ابو الہیاج الاسدی روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا، کیا میں تمہیں اس مشن پر نہ روانہ کروں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کیا تھا، کہ تم کوئی بت نہ دیکھو گے مگر اس کو مٹا دو گے اور کوئی اونچی قبر نہ دیکھو گے مگر اسے برابر کر دو گے؟" (صحیح مسلم)

اب جہاں تک پوپ نوبل کی ہیئت کا گڈا بنانے کا مسئلہ ہے تو ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک اسے بہت تقدس حاصل ہے اور اسی تقدس کی روشنی میں اسے بنا سنوار کر رکھا جائے گا اور یہ وہی کیفیت ہے جو قوم سیدنا نوح علیہ السلام کی بتائی گئی ہے، سورۃ نوح کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا﴾ (سورۃ النوح: 23-24)

"اور انہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ ہی چھوڑنا وُدّ کو اور سواع کو اور نہ ہی یغوث، یعوق اور نسر کو اور انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے اور (اے اللہ!) ان ظالموں کو اور زیادہ کر گمراہی میں۔"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

یہ ان بتوں کے نام ہیں جو سیدنا نوح علیہ السلام کے زمانے میں پوجے جاتے تھے۔"

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"یہ ان نیک لوگوں کے نام تھے جو سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام کے درمیان پائے گئے تھے، ان کے بہت سے پیروکار تھے جو ان کی پیروی کیا کرتے تھے، جب ان نیک لوگوں کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے کہا: کیا ہی اچھا ہو کہ ہم ان کی تصویریں بنا لیں تو ہم عبادت میں زیادہ انہماک حاصل کر سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی تصویریں بنانا شروع کر دیں، جب یہ نسل بھی ختم ہو گئی اور ایک نئی نسل وجود میں آ گئی، تو شیطان نے انہیں بہکایا: تمہارے آباؤ اجداد تو ان کی عبادت کیا کرتے تھے اور ان کی وجہ سے ان پر بارش آتی تھی، تو پھر انہوں نے ان کی پوجا شروع کر دی۔" (تفسیر ابن کثیر: 4/3-5)

گویا یہ عمل شرک کا دروازہ کھولنے کا موجب ہے، اس لیے بہتر ہے کہ اس کام سے اجتناب کیا جائے، روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وعدہ ہے:

﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (سورۃ الطلاق: 2-3)

"اور جو اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کے لیے ایک راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔" (ص ح)

شمسی دستے نصب کرانے کے لیے سود پر قرض لینا

سوال: میں گھر کو گرم رکھنے کے لیے بجلی کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو دیکھتے ہوئے سولر پینل (شمسی توانائی جذب کرنے والے دستے) لگوانا چاہتا ہوں لیکن میں بذات خود اتنی بچت نہیں رکھتا کہ یہ کام کروا سکوں تو کیا میں اس غرض کے لیے بنک سے سود پر قرض لے سکتا ہوں؟

جواب: ایک مسلمان پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ سود کا لینا دینا کتنا بڑا گناہ ہے، قرآن میں اسے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف محاذ جنگ کھولنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے، قرآن کی آیات اور احادیث رسول اس بارے میں واضح ہیں، ہم نے اس سے قبل شدید حاجت جو کہ بمنزلہ ضرورت ہے، کی بنا پر بقدر حاجت سودی قرضے کو لینے کا فتویٰ صادر کیا تھا، مراد ہے وہ فتویٰ جو یورپین کونسل برائے فتویٰ اور ریسرچ نے جاری کیا تھا اور حاجت سے مراد وہ حاجت ہے کہ جس کے بغیر زندگی شدید مشکلات کا شکار ہو جائے اور ایسی حاجت کو اضطرار کے حکم پر قیاس کر کے اس کے جواز کا فتویٰ جاری کیا گیا تھا۔

عام حالات میں تو اس خاص حاجت کو بمنزلہ ضرورت قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر بعض ممالک میں جہاں شدید سردی پڑتی ہے اور بجلی سے گھر گرم رکھنے کے اخراجات بہت زیادہ ہیں، تو ایسی خاص صورت میں مذکورہ بالا فتویٰ کا اس صورت پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ انسان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ جتنا سود سے بچ سکے بچنے کی کوشش کرے کہ اسی میں عافیت ہے۔ (ص ح)

قرض خواہ اگر مفقود ہو تو قرض کسے ادا کرے

سوال: میں عرصہ 20 سال سے اٹلی میں مقیم ہوں، میں نے اس وقت فیکٹری میں اپنے ایک ساتھی سے کچھ رقم بطور قرض لی تھی۔ یہ شخص اس فیکٹری میں کام کرتا تھا اور ساتھ ساتھ ایک چرچ میں بھی پارٹ ٹائم کام کیا کرتا تھا۔ طے پایا تھا کہ میں یہ رقم بالاقساط اسے ادا کرتا رہوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا اور پھر

جب ایک دوسرے شہر منتقل ہو گیا تو پھر بھی ہر مہینے اس کے پاس جاتا اور مطلوبہ قسط اسے لوٹا دیتا، یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گیا ہے۔ پاس پڑوسیوں نے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ شخص غیر شادی شدہ تھا اور تنہا رہتا تھا، اس کا ایک بھائی بھی اسی کی طرح تنہا زندگی گزار رہا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ بھی وفات پا چکا ہے۔ اب میں کافی فکر مند ہوں کہ یہ مال کیسے لوٹاؤں، کیا اسے کسی مسلم ممالک میں بطور صدقہ بھیج دوں؟

جواب: پہلے تو ہم اس شخص کی ہمت کی قدر دانی کرتے ہیں کہ اس نے قرض واپس کرنے کی پوری کوشش کی، قرض خواہ کی موت کے بعد اس کے عزیز و اقارب کی کھوج لگائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا صرف ایک بھائی تھا اور وہ بھی انتقال کر چکا ہے اور اگر ایسی صورتحال ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس رقم کو ان لوگوں میں صدقہ کر دے جو اس سے دوستی یا قرابت کا تعلق رکھتے ہوں یا عام حاجت مند ہوں۔

شیخ عبد الرزاق عفیفی حفظہ اللہ جو کہ لجنہ کبار العلماء (سعودی عرب) کے ممبر رہے ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ ایک بدّو نے کسی دوسرے شخص کے اونٹ غصب کر لیے اور پھر اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ یہ اونٹ اسے لوٹا دے، لیکن اس کے بیٹے نہ اسے جانتے ہیں نہ اس کے والی وارثوں کو تو شیخ نے جواب دیا کہ وہ ان اونٹوں کی موجودہ قیمت نکالے اور اسے فقراء اور محتاجین پر صدقہ کر رہے اور مسلمانوں کے فائدے کے کسی بھی کام میں لگا دے۔ (بحوالہ فتاوی ورسائل سماحۃ الشیخ عبد الرزاق عفیفی: ص474) (ص ح)

لکڑی کے ایک ٹکڑے کی بیع کا مسئلہ

سوال: اٹلی میں میرے ایک مسلم دوست کا لکڑی کا کارخانہ ہے، اس سے ایسے لکڑی کے ٹکڑے بنانے کا آرڈر دیا گیا ہے جو شراب کی بوتلوں پر بطور ڈاٹ استعمال ہوں گے اور ان بوتلوں میں شراب بھری جائے گی تو کیا وہ ایسے آرڈر کو قبول کر سکتا ہے؟

جواب: ایک مسلمان کے لیے کوئی بھی مباح کام کرنا جائز ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا اس کی بنائی ہوئی چیز کسی حلال غرض کے لیے ہے یا حرام کے لیے، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کو ایک چھری فروخت کی اور اس نے اس چھری سے کسی کو قتل کر ڈالا، ایسی صورت میں بائع ضامن نہیں ہو گا، ایسے ہی اگر کسی شخص نے کہیں جانے کے لیے گاڑی اجرت پر لی، لیکن وہ اس نے چوری کرنے کے لیے استعمال کر لی تو گاڑی کا ڈرائیور جوابدہ نہ ہو گا۔

اس میں یہ اصول کار فرما ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں سبب اور علت جمع ہو جائیں تو حکم علت کی بنیاد پر ہو گا نہ کہ سبب پر، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک انسان نے اپنے باغ میں کنواں کھودا جس میں ایک دوسرا شخص گر گیا، تو کنویں کا مالک ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا اور وہ اس لیے کہ کنواں سبب ہے، لیکن آدمی کے اس میں گر جانے کی علت نہیں ہے اور ایسے ہی اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کے مال کی نشاندہی کی اور اس نے جا کر وہ مال چرا لیا یا اس نے کسی قافلے کے بارے میں بتایا اور جسے بتایا تھا اس نے قافلے کو لوٹ لیا تو رہنمائی کرنے والے کو ضامن قرار نہیں دیا جائے گا۔

اور اس اصول کے مطابق آپ کا اٹلی والا دوست اگر یہ لکڑی کا ٹکڑا کسی کو فروخت کرتا ہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے لیکن اگر خریدار اسے کسی حرام یا مکروہ کام کے لیے استعمال کرتا ہے تو آپ کا دوست اس گناہ کا مرتکب قرار نہیں دیا جائے گا چاہے اسے مشتری کا قصد معلوم کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ بیع اس کے حرام فعل کی علت نہیں ہے۔ (فتویٰ کونسل یورپ)

گود لی بچی کو زکوٰۃ دینا

سوال: میں نے ایک بچی کو گود لے کر پالا ہے؟ کیا اسے زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟

جواب: اصول یہ ہے کہ جن لوگوں کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی ان میں مالدار حضرات، خود اپنی بیوی اور تمام آبائی یا صلبی اولاد کہ جن کا نان و نفقہ انسان پر واجب ہے، شامل ہیں، ان کے علاوہ وہ رشتہ دار جن میں بھائی بہن، چچا، پھوپھی اور خالائیں شامل ہیں، انہیں اور ان کی غریب اور مستحق اولاد کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اور اس عمل میں دہرا اجر ہے، ایک تو صدقہ دینے کا اور دوسرے صلہ رحمی کا۔

جامع ترمذی کی روایت ہے کہ سلمان بن عامر الضبی نے نبی ﷺ سے نقل کیا: کہ ایک فقیر کو صدقہ دینا، ایک صدقہ کے برابر ہے لیکن اپنے قریبی رشتہ کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔

یہ روایت دوسرے محدثین سے بھی مروی ہے اور یہ بات علماء میں معروف ہیں بلکہ ان کا اس بات سے بالکل اتفاق بھی ہے۔

اور جس بچی کو آپ نے بچپن سے پالا پوسا ہے، وہ آپ کی حقیقی بیٹی نہیں ہے، بلکہ اور اس کے اور آپ کے درمیان کوئی رحمی رشتہ بھی نہیں ہے تو اگر وہ مستحق ہے تو اسے صدقہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی بھی فقیر اور محتاج کو دیا جائے اور یہاں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس عمل میں بھی کسی کی مدد کا جذبہ اور احسان شامل ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اجر دوبالا ہو جائے گا کیونکہ ہر وہ عمل جس میں لوگوں کے درمیان رشتوں کی تقویت مقصود ہو وہ شرعاً محبوب اور مرغوب ہے۔ (فتویٰ کونسل یورپ)

ایک عیسائی کی تحدید نسل کے لیے آپریشن کرنا

سوال: میں خود ایک ڈاکٹر ہوں اور میرے پاس عیسائی مریض بھی آتے ہیں جو تحدید نسل کی خاطر مادہ منویہ کو آپریشن کے ذریعے کاٹ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا جائز ہو گا؟

جواب: ایک مسلمان مرد یا عورت کے لیے ایسا آپریشن کرانا کہ جس میں آئندہ اولاد ہونے کا راستہ ختم ہو جائے یا عورت کبھی حاملہ نہ ہو سکے، جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات شریعت کے مقاصد کی نفی کرتی ہے، البتہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر عارضی طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے، ایک مسلمان ڈاکٹر کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایک مسلمان مریض کے لیے کوئی غیر شرعی کام کرے، البتہ غیر مسلم حضرات اسلامی

شریعت کے احکام کے پابند نہیں ہیں، تو اگر وہ خود یہ آپریشن کروانا چاہتا ہو اور ایک مسلمان ڈاکٹر سے اس کام کے لیے رجوع کرے تو ایسے مسلمان ڈاکٹر کے لیے اس کی خواہش پوری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ایسا کرنا ملکی قانون کے واڑرے سے باہر نہ ہو۔ (فتویٰ کونسل یورپ)

اسقاط شدہ بچے کی نماز جنازہ اور غسل کا حکم

سوال: نوٹنگھم سے ایک صاحب علم نے دریافت کیا ہے کہ اگر ایک چھ سات ماہ بچے کا حمل ساقط ہو جائے تو اسے غسل دینے اور اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ وہ خود سنن ابو داؤد کی ایک حدیث کے مطابق اسے جائز سمجھتے ہیں، لیکن ایک دوسری رائے کے مطابق ایسا کرنا ضروری نہیں ہے تو آیا ایسے بچے کی قبر پر عرصہ دراز کے بعد نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: جمہور فقہاء (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم) کے نزدیک اگر بچہ مردہ پیدا ہوا ہے تو دیکھا جائے گا کہ بوقت ولادت اس کی آواز (چیخ، چھینک) سنی گئی تھی یا نہیں؟ اگر سنی گئی تھی تو اسے غسل بھی دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور اس کی دلیل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الطفل لا يصلى عليه ولا يرث ولا يورث حتى يستهل» (رواه الترمذی وابن ماجه إلا أنه لم يذكر ولا يورث)

”بچے پر نماز نہ پڑھی جائے گی، نہ وہ کسی کا وارث ہو گا اور نہ کوئی اس کا وارث ہو گا جب تک کہ اس کی آواز نہ نکلے۔“

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، آخر الذکر میں: ”کوئی اس کا وارث نہ ہو گا۔“ کے الفاظ نہیں ہیں۔

تابعین میں سے اس رائے کے حامل امام زہری، امام نخعی، امام حماد اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہم بھی ہیں۔

دوسری رائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور وہ یہ کہ اگر چار ماہ کے بچے کا بھی اسقاط ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے کیونکہ چار ماہ کے بعد جنین میں روح پھونک دی جاتی ہے ور اس کی دلیل سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«والسقط يصلى عليه ويدعى بوالديه بالمغفرة والرحمة»

(سنن ابو داؤد، مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

”اسقاط شدہ بچے پر نماز پڑھی جائے اور اس کے والدین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کی جائے۔“

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحابہ میں سے اور سعید بن المسیب، ابن ابی لیلیٰ اور محمد بن سیرین تابعین میں سے اس رائے کے حامل ہیں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم ضعیف ہیں اور دوسری سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے ابو الزبیر مکی ہیں جو کہ مدلس ہیں اور اس روایت میں انہوں نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سماعت کی صراحت نہیں کی ہے۔

اس اختلاف رائے کی بنا پر یہ کہنا درست ہو گا کہ اسقاط شدہ بچے پر نماز جنازہ پڑھنا افضل ہے لیکن اگر نہ پڑھی گئی تو اس پر بھی نکیر نہیں کی جائے گی۔

اب رہا دوسرا مسئلہ کہ ایسے بچے پر اگر نماز نہیں پڑھی گئی تو عرصہ دراز کے بعد قبر پر نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ کو اگر وسیع تناظر میں لیا جائے کہ آیا کسی بھی میت پر بعد از دفن نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس میں اس بات کی گنجائش نکلتی ہے کہ اگر میت پر سرے نماز نہیں پڑھی گئی یا کوئی شخص نماز میں حاضر نہ ہو سکا اور وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اس عورت کو جو کہ مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، ان کے علم میں لائے بغیر دفنا دیا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان تشریف لائے اور قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔

لیکن ایسا کرنا بعد از دفن کتنی مدت تک جائز ہو گا؟

حنبلی مذہب میں اس بارے میں یہ آرا ملتی ہیں:

1۔ جس شخص کی نماز جنازہ فوت ہو جائے وہ ایک ماہ کے اندر اندر نماز ادا کر سکتا ہے۔

2۔ ایک سال تک ایسا کر سکتا ہے۔

3۔ اس وقت تک نماز پڑھنے کی گنجائش ہے جب تک کہ یہ یقین حاصل ہو کہ میت کی ہڈیاں گل چکی نہ ہوں گی۔

4۔ بجائے نماز پڑھنے کے میت کے لیے دعا کرتا رہے، خاص طور پر اگر وہ والدین ہوں۔ (بحوالہ الانصاف، للمرداوی الحنبلی)

ظاہر ہے کہ اسقاط شدہ بچے کی نماز میں ویسے ہی اختلاف ہے چہ جائیکہ اس کے دفن پر عرصہ دراز گزر چکا ہو۔ (ص ح)

☆☆☆

انتقال پُر ملال

جامع مسجد کوئینس کراسی ڈڈلی کے مخلص کارکن حاجی محمد یونس جنجوعہ کی اہلیہ محترمہ 55 سال کی عمر میں نماز فجر اور تلاوت قرآن کے بعد اچانک سانس لینے میں دشواری محسوس کی اور شوہر نامدار اور ایمبولینس آنے تک وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

إنا لله وإنا إليه راجعون

اللہ کریم نے شادی کے 25 سال انہیں ایک بیٹا عطا کیا تھا جو اب 12 سال کا ہونہار ہے، ڈاکٹر عبد الرب ثاقب ڈڈلی نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور وہی تدفین عمل میں آئی، رشتہ داروں اور دوست واحباب، خواتین و حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور مرحومہ کے لیے جنت الفردوس اور متعلقین کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلا ہے پانی کا

حدیث نمبر:35

عَن أَبِي جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بنِ عَلِيِّ بنِ الحُسَينِ بنِ عَلِيِّ بنِ أَبِي طَالِبٍ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ، أَنَّهُ كَانَ هُوَ وَأَبُوهُ عِنْدَ جَابِرِ بنِ عَبْدِ اللهِ، وَعِنْدَهُ قَوْمٌ، فَسَأَلُوهُ عَنِ الغُسْلِ؟ فَقَالَ: صَاعٌ يَكْفِيكَ، فَقَالَ رَجُلٌ: مَا يَكْفِينِي، فَقَالَ جَابِرٌ: كَانَ يَكْفِي مَن هُوَ أَوْفَى مِنْكَ شَعَراً، وَخَيْراً مِنْكَ - يُرِيدُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَمَّنَا فِي ثَوْبٍ.

وَفِي لَفْظٍ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُفْرِغُ المَاءَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثاً.

قَالَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: الرَّجُلُ الَّذِي قَالَ: ((مَا يَكْفِينِي)) هُوَ الحَسَنُ بنُ مُحَمَّدِ بنِ عَلِيِّ بنِ أَبِي طَالِبٍ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَبُوهُ مُحَمَّدُ بنُ الحَنَفِيَّةِ. (رواه البخاري، كتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوه، برقم 252. رواه البخاري، كتاب الغسل، باب من أفاض على رأسه ثلاثاً، برقم 255، و256، وأخرجه مسلم بنحوه، كتاب الغسل، باب استحباب إفاضة الماء على الرأس وغيره ثلاثاً، برقم 329)

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ

سیدنا ابو جعفر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے روایت ہے وہ اور اس کے باپ سیدنا جابر بن عبداللہ کے پاس تھے ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے انہوں نے آپ سے غسل کے بارے میں سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"تیرے لیے ایک صاع کافی ہے اس آدمی نے کہا میرے لئے کافی نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے بال تجھ سے زیادہ گھنے تھے اور وہ خود تجھ سے بہتر تھا اس کے لئے تو غسل کے لئے اتنا پانی کافی تھا۔"

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے پھر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں ہمیں نماز پڑھائی۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر پر تین مرتبہ پانی ڈالتے۔

مصنف کا بیان ہے کہ وہ شخص جس نے یہ کہا کہ ایک صاع پانی میرے لئے کافی نہیں۔ وہ حسن بن محمد بن علی بن ابی طالب تھا اس کا والد محمد بن حنفیہ تھے۔ (بخاری و مسلم)

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی

1: يَكْفِيكَ: تیرے لیے کافی ہے۔

2: صَاعٌ: چیزوں کے ماپنے کا ایک پیمانہ ہے۔

3: مَا يَكْفِينِي: میرے لیے کافی نہیں۔

4: أَوْفَرَ مِنْكَ شَعْرًا: تجھ سے زیادہ گنے بال تھے۔

5: أَمَّنَا: اس نے ہمیں (نماز کی) امامت کرائی

6: فِي ثَوْبٍ: ایک کپڑے میں۔

7: يُفْرِغُ: وہ انڈیلتا ہے۔

حدیث مبارکہ سے حاصل ہونے والے بعض مسائل اور احکام

1۔ آل رسول اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپس میں محبت ایک دوسرے کی محافل و مجالس میں جانا اور ایک دوسرے سے مسائل پوچھنا اور مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و عمل کو اپنے درمیان دلیل فیصل سمجھنا۔ اور یہی آج کے مسلمان کے لیے بھی درست طریقہ و منہج ہے۔

2۔ غسل جنابت فرض ہے خواہ تھوڑے پانی سے ہو۔

3۔ غسل جنابت کے لئے ایک صاع پانی کفایت کر جاتا ہے ایک صاع چار مد کا ہوتا ہے۔ اور ایک مد ایک انسان کے دو ہاتھ بھر کر کسی چیز کی مقدار ہے۔ ظاہر ہے چیزوں کے مختلف ہونے سے گرام میں وزن مختلف ہو گا۔ پانی کا ایک صاع اڑھائی کلو گرام سے تین کلو گرام تقریباً ہے۔

4۔ ایک صاع پانی موجود ہو تو اس شخص کو غسل کرنا فرض ہو گا جس پر غسل فرض ہے یعنی ایسا شخص تیمم نہیں کر سکتا ہے۔

5۔ پانی کی اگر قلت ہو تو غسل کے لئے تھوڑا پانی استعمال کرنا مستحب ہے۔ اور عموما بھی پانی کو کم استعمال کرنا مستحب ہے۔

6۔ غسل میں سر کے بالوں کو اچھی طرح دھونا اور بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔ تین بار سر پر پانی ڈالنا سنت ہے۔

7۔ مرد کے لیے ایک کپڑے میں نماز پڑھنا پڑھانا درست ہے، غربت وغیرہ کی وجہ سے کپڑے کم ہونے کی صورت میں مرد بڑی چادر وغیرہ کو ایسے پہنے گا کہ اس کے کندھے اس ڈھانپ جائیں البتہ فراوانی ہو تو نماز کے لیے مناسب اور عمدہ لباس پہن کر نماز پڑھنا پڑھانا افضل ہے۔

8۔ یہ حدیث مرد کے لیے ننگے سر نماز پڑھنے پڑھانے پر بھی دلیل ہے مگر ایسا لباس پہننا جو مناسب اور معززانہ ہو افضل ہے۔

9۔ اتباع رسول کی فضیلت و مقام۔

حدیث نمبر:36

عَن عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى رَجُلاً مُعْتَزِلاً لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ، فَقَالَ : «يَا فُلانُ، مَا مَنَعَكَ أَنْ تُصَلِّيَ فِي الْقَوْمِ؟»، قَالَ : يَا رَسُولَ اللهِ، أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ، وَلاَ مَاءَ، قَالَ: «عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ، فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ»

(رواه البخاري، كتاب التيمم، باب: برقم 348، واللفظ له، ومسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، برقم 682)

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھا اس نے قوم کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اے فلاں تجھے کس چیز نے روکا کہ تو قوم کے ساتھ نماز پڑھے؟ اس نے کہا:

یارسول اللہ ﷺ! میں جنبی تھا اور پانی میسر نہیں تھا آپ نے ارشاد فرمایا: مٹی کو لازم پکڑو یہ تیرے لئے کافی ہے (یعنی تیمم کر لو) (بخاری ومسلم)

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی

1: مُعْتَزِلُ :الگ ہونے والا۔

2:اَلصَّعِيْدُ: مٹی، میدان۔

3:لَمْ يُصَلِّ فِي الْقَوْمِ: جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی۔

4:اَصَابَتْنِيْ جَنَابَةٌ: مجھے جنابت لاحق ہوگئی۔ (میں جنبی ہوں)۔

حدیث مبارکہ سے حاصل ہونے والے بعض مسائل اور احکام

1۔ امیر کا اپنی قوم کے ہر فرد کا خیال رکھنا اور ضرورت پڑنے پر کسی سے پوچھ کچھ کرنا۔

2۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غیب نہیں جانتے تھے۔

3۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کا خیال رکھتے اور یہی طرز ہر عالم، امیر و قائد وغیرہ کو اپنانا چاہیے۔

4۔ بعض دفعہ نام کے بجائے فلاں کہ کر بلانا حکیم ہونے کی نشانی ہے۔

5۔ کسی مسئلہ کا پتا نہ ہونا عیب نہیں ہے۔ البتہ کسی مسئلہ کا علم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھنے کا حکم ہے۔

6۔ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرنا درست ہے مگر جب دلیل مل جائے تو پھر اپنے اجتہاد کو چھوڑنا ضروری ہے۔

7۔ ازالہ جنابت میں تیمم غسل کے قائم مقام ہوتا ہے۔

8۔ تیمم اس صورت میں ہوگا جبکہ پانی میسر نہ ہو یا پانی کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ ہو۔

9۔ دعوت و اصلاح میں اعلی اور عمدہ اخلاق کو اپنانا۔

10۔ دوسری روایات کے مطابق یہ واقعہ فجر کی نماز میں ہوا ہے اور نماز میں شریک نہ ہونے والے عظیم صحابی رسول سیدنا خلاد بن رافع بدری رضی اللہ عنہ تھے۔

11۔ جنبی بغیر غسل یا تیمم کے نماز نہیں پڑھ سکتا ہے البتہ باقی کام مثلا بات چیت ذکر و اذکار وغیرہ کر سکتا ہے۔

12۔ مسلمان جنابت سمیت کسی حالت میں بھی پلید نہیں ہوتا ہے البتہ جنبی کو نماز کے لیے غسل یا تیمم کا حکم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

سیدنا حسنین رضی اللہ عنہما کی ولادت اور ناموں کا تعین

نبوی آنگن کے پہلے پھول، سبط اکبر سیدنا حسن صحیح قول کے مطابق رمضان 3ھ میں پیدا ہوئے اور سیدنا حسین۔ شعبان 4ھ کے کسی دن پیدا ہوئے تھے۔ (نسب قریش: 1/23) دونوں بھائیوں کی پیدائش میں گیارہ ماہ کا فاصلہ تھا۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا آنگن خوشیوں سے بھر گیا۔ والد سیدنا علی بھی بہت خوش تھے۔ صحابہ نے انہیں پہلے بیٹے کی مبارکباد دی۔ نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ خوشی سے سرشار ہوگئے۔ آپ فوراً اٹھے اور بیٹی زہرا کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر پوچھا کہ میرا بیٹا کہاں ہے، اسے لاؤ۔ بیٹے کو لایا گیا۔ آپ ﷺ نے انہیں ہاتھوں میں اٹھایا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ان کے نام کے بارے میں پوچھا۔ سیدنا علی سے روایت ہے کہ جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو انہوں نے ان کا نام حمزہ رکھا۔ بعد ازاں جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو انہوں نے اس کا نام جعفر رکھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا بھیجا اور فرمایا کہ مجھے ان دونوں کے نام تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ آپ نے ان دونوں کو حسن اور حسین کے نام دیے۔“ (مسند احمد: 1/160(1370))

اس روایت سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں بچوں کے نام تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا تھا، چنانچہ آپ نے فوراً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور بچوں کے نام تبدیل کر دیے۔

حل حلول سے حبرون الخلیل کی طرف روانگی

یہ علاقہ خالص فلسطینی ریاست کا حصہ تھا۔ شہر سے باہر نکلتے وقت ایک اجڑا اسا دیار نظر آیا۔ پوچھنے پر بتایا گیا یہ مہاجرین کا کیمپ تھا جہاں فلسطینی زبردستی جمع کیے جاتے تھے۔ دل پہلے ہی رنج و غم سے ڈوبا ہوا تھا اس کیمپ کی پھٹی پرانی حالت دیکھ کر مزید چبھن ہونے لگی۔ کچھ کلو میٹر بعد پھر اسرائیل کے زیر تسلط علاقہ شروع ہو گیا اور یہاں کا مشہور شہر الخلیل ہے جسے حبرون بھی کہا جاتا ہے اور شاید نابلس بھی کیونکہ پرانی تفاسیر میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا مقام تدفین نابلس لکھا گیا ہے۔ جسے راقم نے بھی تفسیر سورہ یوسف بنام 'حسن و جمال کا چاند' میں نقل کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر بھی فلسطینی بچوں کی غربت دیکھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ یہ خالص سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زر خرید جگہ تھی۔ یہیں انہوں نے ایک اپنے اور اپنے خاندان کے دفن ہونے کے لیے ایک غار بھی متعین کی تھی۔ یہاں کی مسجد الخلیل میں ان کی قبور کے نشانات ہیں۔ ہم نے طہارت خانے جا کر وضو کیا وہاں برطانیہ سے آئے ہوئے کافی لوگ وضو بنا رہے تھے۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کئی افراد جو بولٹن پریسٹن اور بلیک برن (برطانوی شہروں) سے تعلق رکھتے تھے۔ وضو بنا رہے تھے۔ اپنے بھائیوں کو یہاں اتنی تعداد میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کچھ کے ساتھ تعارف بھی ہوا۔ حبرون پر بھی اور مسجد الخلیل پر بھی یہودیوں کا قبضہ ہے۔ سیکیورٹی بڑی سخت ہے جس سے گزر کر ہم مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ مسجد میں جا کر ظہر و عصر کی نمازیں جمع کیں۔ اسی مسجد میں قبور والی غار کا دہانہ بند کر کے چھوٹی سے سوراخ پر جالی فٹ کر دی گئی ہے۔ اسی غار میں واقع قبور کہا جاتا ہے کہ تقریبا 60،70 گز نیچے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان کی زوجہ سیدہ سارہ، سیدنا اسحاق علیہ السلام ان کی بیوی سیدہ رفقہ کی قبور نیچے ہیں اور اوپر محض نشانات۔ نیچے سے اس غار کو راستہ جاتا ہے بعض دوستوں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ ان کی زبانی پتہ چلا ہے۔ مسجد ابراہیمی کا ایک حصہ ممنوع ایریا ہے۔ اس پر اسرائیلیوں نے تالے ڈال رکھے ہیں بلکہ دیوار بنا کر مسجد الخلیل کو بھی 2 حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ بتایا گیا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام، سیدنا ایوب علیہ السلام اور ان کی فیملی کی قبور شریفہ کو الگ کر رکھا ہے۔ یہ کیسی نالائق اولاد ہے جو بعد از مرگ بھی انہیں الگ الگ رکھنے پر مصر ہے، حالانکہ وہ سب انبیاء ایک دوسرے کے ساتھ رشتے میں بھی جڑے ہوئے تھے اور دینی طور پر بھی سمیت ایک ہی دین۔۔۔ دین اسلام کے ماننے والے تھے۔ ان بدعتی اور مشرکین نے انہیں بھی بابا جمال و جہال کی طرح مال میراث بنا رکھا ہے۔ ان قبور کی زیارت عام دنوں میں نہیں کی جا سکتی۔ عجیب تماشا ہے کہ یہ مسجد الخلیل یہودی قبضے میں اور تولیت مسلمانوں کی ہے لیکن وہاں اذان کے لیے قابضین کی اجازت ضرورت ہے۔ وہ اجازت دیں تو اذان ہو گی نہ دیں تو بیٹھے رہیں اور بغیر اذان کے ہی نمازیں ادا کریں۔ ہم نے تو ایک نماز اذان کے بعد ہی باجماعت ادا کی تھی۔ عصر بھی ساتھ ہی پڑھ لی کہ حالت سفر میں ہیں۔ قبور انبیاء بلکہ اپنے جد امجد کی قبر مبارک کے سائن پر کھڑے ہو کر میں سوچتا رہا۔

میرے ذہن میں کائنات کی اس عظیم ہستی کی تاریخ گھومنے لگ گئی۔ ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام جیسی ہستی کی جائے پیدائش بابل (عراق) کا شہر "ار" ہے۔ انہوں نے تقریباً 100 سال تک لوگوں کو اپنی قوم کو بلکہ حاکم وقت کو مسلمان کرنے میں دعوت دی لیکن نتیجہ کیا نکلا کہ انہیں آگ میں پھینک دیا جو باذن الٰہی گلزار بن گئی اور آپ سلامتی کے ساتھ اس سے نکل آئے اور اللہ کے حکم سے آپ نے اپنی زوجہ سیدہ سارہ اور بھتیجے سیدنا لوط کے ساتھ مصر کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کے بادشاہ نے ان کی غیر معمولی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنی شہزادی سیدہ ہاجرہ آپ کے عقد میں دے دی۔ جن کے بطن سے حق تعالیٰ نے پہلا بیٹا سیدنا اسماعیل عنایت فرمایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس نومولود کو اس کی والدہ سمیت وادی حجاز وادی غیر ذرع (بے آب و گیاہ) لے جائیں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیٹے کو وادی حجاز میں اس جگہ چھوڑ آئے جہاں آج کعبۃ اللہ ہے۔ یوں یہ وقت کی شہزادی اپنے معصوم بچے کے ساتھ تن تنہا لق و دق صحراء میں اللہ کی رضا کی خاطر سختیاں سہتی رہی۔ جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ اس دوران میں اللہ نے پہلی بیوی سارہ کی گود بھی ہری کر دی۔ ان کے بطن سے دوسرا بیٹا سیدنا اسحاق علیہ السلام تولد ہوا۔ آپ فلسطین کے علاقے حبرون میں تشریف لے آئے۔ دوسرے بیٹے سیدنا اسحاق علیہ السلام کی پرورش یہاں ہوئی۔ بڑے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے وادی حجاز میں اللہ کی عبادت کے لیے دنیا میں سب سے پہلے ایک گھر

تعمیر کیا جسے بیت اللہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور دوسرے بیٹے سیدنا اسحاق علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے 40 سال بعد یہاں ایک مسجد بنائی جسے مسجد اقصی کہا جاتا ہے۔ گویا یہ خاندان جہاں بھی گیا اللہ کی عبادت کے لیے گھر بناتا رہا۔ انہی کی سنت کو خاتم الانبیاء ﷺ نے زندہ کیا اور دنیا کے سارے کنارے اللہ کی مساجد کی تعمیر سے بھر دیے۔ بعد میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے ایسے نالائقوں نے جنم لیا جنہوں نے دین اسلام کو یہودیت میں پھر عیسائیت میں بدل دیا۔ یوں جس توحید کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ساری زندگی صرف کر دی تھی اسے اس نالائق ذریت نے شرک میں بدل ڈالا اور آج دنیا میں سب سے زیادہ ظلم پھیلانے والے یہی لوگ ہیں اور ان کا دعوی ہے کہ وہ ابراہیمی دین کے وارث ہیں۔ ”برعکس نام نہند زنگی کافور“۔ مسجد الخلیل میں ان پاک باز ہستیوں کی قبور ہیں جو کہا جاتا ہے 60، 70 گز نیچے ہیں اوپر ان جگہوں کی نشاندھی کے لیے نشانات بنا دیے گئے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول سرور انبیاء ﷺ کی تربت شریفہ کے کسی نبی کی قبر مبارک کی بالکل صحیح جگہ کی نشاندھی نہیں کی جاسکتی۔ اسی غار کے اوپر بنی ہوئی مسجد الخلیل میں داخل ہوں تو سیدہ سارہ کی قبر مبارک دکھائی دیتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوں تو بائیں طرف 2 قبور ہیں ایک سیدہ رفقہ زوجہ نبی اسحاق اور اس سے متصل خود نبی اسحاق کی قبر شریف، اس کے پہلو میں ایک بہت بڑا اونچا منبر ہے۔ جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے نصب فرمایا تھا۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا جنگلہ ہے جہاں پہلے کبھی سیڑھیاں ہوا کرتی تھیں جو قبور شریفہ تک جاتی تھیں۔ سیکیورٹی نقطہ نظر سے ان سیڑھیوں کو بند کر دیا گیا اور وہاں ایک نشان بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دروازہ ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قبر شریف کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے بعد سیدنا یعقوب اور سیدنا یوسف اور سیدنا ایوب علیہم السلام کی قبور ہیں جنہیں اسرائیلیوں نے یہاں تسلط کے بعد ایک دیوار بنا کر الگ کر ڈالا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زیارت صرف رمضان المبارک کے آخری عشرے میں کروائی جاتی ہے۔ یا کوئی گارڈ واقف کار مل جائے تو وہ بھی یہ دروازہ کھول کر قبور شریفہ کی زیارت کروا سکتا ہے۔ ہم نے ان سب پاکباز ہستیوں پر درود و سلام پڑھ کر ہدیہ عقیدت پیش کیا اور دیر تک وہاں کھڑے رہے اور اس احساس کے ساتھ کھڑے رہے کہ ہم جیسے گناہ گار اور بے مایہ لوگ کتنی پاکباز ہستیوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اللہ مالک الملک کا یہ احسان عظیم اور اپنے عجز و بے مائیگی کا احساس بہت شدت اختیار کرتا جارہا تھا اتنے میں آواز آئی کہ ایک قافلہ آیا ہوا ہے اور اس نے نماز باجماعت شروع کر دی ہے ہم بھی جماعت کے ساتھ مل گئے اور دونوں نمازیں ہم نے جمع کر کے پڑھ لیں۔ سفر میں جمع بین الصلوتین ایک بڑی سہولت ہے۔ نماز کے بعد وہاں کینیڈا، ترکی اور مصر سے آئے ہوئے زائرین میں سے بعض کے ساتھ ملاقات ہوئی اور تحیہ و سلام کا تبادلہ ہوا۔

تاریخی عجوبہ۔۔۔منبر ایوبی کی موجودگی

مسجد الخلیل میں بھی ایک عجوبہ دیکھنے کو ملا اور وہ تھا سلطان صلاح الدین ایوبی کا بنایا ہوا منبر، جو بالکل اصلی حالت میں ابھی تک موجود ہے۔ الحمد للہ۔ روایت کے مطابق سلطان مصر صلاح الدین ایوبی نے بڑی بڑی 3 مساجد کے لیے 3 منبر بنوائے تھے۔ جب وہ بھی عیسائی قابضین پر حملہ آور ہوتے تو یہ تینوں منبر اپنے ساتھ رکھتے۔ سولہ جنگوں کے بعد اللہ نے حق کو فتح عطا فرمائی تو ان میں سے ایک منبر مسجد اقصیٰ میں ٹکایا گیا اور دوسرا اسی مسجد ابراہیمی میں اور تیسرا دمشق کی جامع مسجد میں۔ مسجد اقصی میں موجود منبر 1969ء تک 900 سال تک علماء و خطباء کے زیر استعمال رہا۔ پھر ایک بدبخت یہودی نے اسے آگ لگا دی اور وہ جل گیا۔ وہ اسی حالت میں مسجد اقصی کے پہلو میں موجود ہے۔ باقی دونوں منبر سلامت ہیں۔ اللہ انہیں بدبختوں کی شرارتوں سے محفوظ رکھے۔ یہ منبر 14 فٹ اونچا ہے اور تاریخ کا عجوبہ ہے کہ اتنے بڑے منبر کو بغیر کسی کیل کے یا گلو کے بنایا گیا ہے۔ اگر اس میں کوئی کیل استعمال کیا گیا ہوتا یا گلیو لگائی گئ ہوتی تو اب تک اکھڑ چکا ہوتا۔ مگر 918 سال سے یہ منبر پوری آب و تاب کیساتھ موجود ہے الحمد للہ۔ اتنی زبردست ڈیزائننگ ہے کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ لگتا ہے پورے ایک دیوہیکل درخت کو اتنی خوبصورت گرافی کے ساتھ منبر میں ڈھالا گیا ہے جسے دیکھ کر آدمی ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ مجھے اس منبر کے ساتھ کھڑے ہو کر اس علاقے، اس مسجد مبارک اور اس کے بانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اس منبر کے بانی سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت کا تعارف کرانا تھا۔ نماز کے بعد یہ فریضہ بھی سرانجام دیا گیا۔ کچھ اس جگہ کی عظمت واہمیت کچھ سلطان صلاح الدین کی شجاعت اور کچھ امت مسلمہ کی بیچارگی اور کچھ یہ احساس ستارہا تھا کہ آج ہم جیسے گناہگار اس مقدس و تاریخی جگہ پر کھڑے ہیں جو محض اللہ کا فضل ہی ہے ورنہ

کہاں میں اور کہاں نکہت گل... نسیم صبح تیری مہربانی

آپ کو مسجد الخلیل مسجد ابراہیمی کی زیارت کا موقع ملے تو اس عظیم الشان شاہکار کو اس نظر سے ضرور دیکھیے گا۔ جس سے آپ کو اپنے اسلاف کی عظمت کا احساس ہو گا۔

بیت اللحم۔۔۔جائے ولادت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

الخلیل سے فارغ ہو کر ہم بیت اللحم کے لیے روانہ

ہوئے۔ حبرون سے وہ کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ علاقہ خالص مسلمانوں کا ہے یہاں لوگوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ اس لیے عام چیزیں بھی اسرائیلی مقبوضہ علاقوں سے نسبتاً سستی ہیں۔ ہم نے یہاں فلسطینی ہوٹل میں لنچ کیا۔ بازار کا چکر لگاتے ہوئے اپنی بچی فریال کے لیے ایک بڑی خوبصورت فراک پسند آئی اور کچھ ڈرائی فروٹ کے پیکٹ خریدے۔ اسی شہر میں سیدنا داؤد علیہ السلام سے منسوب ایک بہت بڑا محل بھی دریافت ہوا ہے۔ شہر کے قلب میں بلدیہ کے دفاتر ہیں، یہاں فلسطینی پولیس کے خوبصورت جوان نیلی وردیوں میں بڑے خوبصورت اور چاق و چوبند نظر آئے۔ بلدیہ کے دفاتر کے ساتھ مسجد ہے جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ یہاں کا مشہور سیاحتی مقام سیدہ مریم کے نام سے موسوم 1400 سال پرانا کنیسہ ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ اس کے مرکزی گیٹ میں سے داخل ہوں تو دائیں جانب اس چرچ کا بہت بڑا حصہ برائے فروخت صلیب کے نشانات اور پرچموں سے اٹا پڑا ہے۔ گویا اس نام سے کاروبار خوب چمک رہا ہے۔ اتنی دیر میں ایک فلسطینی سپاہی جو چرچ کا انتظام کرتے ہیں، میرے پاس آیا سلام کیا۔ حال احوال پوچھا۔ اور بولا کہ آپ نے چرچ اندر سے دیکھنا ہے، میں نے کہا۔ ہاں! تو بولا آپ ٹوکن لے لیں۔ میں نے کہا، یا اخی! اب تو ہم آگے نکل آئے ہیں واپسی ناممکن ہے تو وہ خاموش ہو گیا۔ ہم بغیر ٹوکن لیے جوتوں سمیت چرچ کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ جائے ولادت پر جانے کے لیے بہت نشیبی ایریا کے لیے چھوٹے سے دروازے سے باری باری گزرنا پڑتا تھا۔ بڑی تعداد میں سیاح حضرات مرد و عورت قطار بنائے ہوئے اندر داخل ہونے کے منتظر تھے۔ وہاں خواتین کو بھی حجاب پہننا پڑتا تھا۔ یعنی اصل چیز حجاب ہی ہے جو ''نن'' کا مستقل لباس ہے۔ لیکن مسلمان عورت کا زیور ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے۔ یہ عزتِ نسواں کا لازمی عنصر ہے، نشانِ عفت و پاکدامنی ہے اور مذہبی تقدس کا حصہ بھی۔ عیسائیوں کے ہاں صرف کنواری مریم حجاب پہنتی ہے اور امتِ اسلام کی ہر بیٹی عفیفہ مریم و عائشہ و فاطمہ کی پیروکار ہے۔ اپنی باری آنے پر ہم اندر داخل ہوئے تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی جگہ ایک شیلف بنی ہوئی ہے جسے بتیوں سے روشن رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں جذع النخلہ (کھجور کا تنا بتایا گیا تھا) اس جگہ کی نشاندھی میں کھجور کے مصنوعی پتے رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی قرآن کے بیان کی تصدیق کی گئی ہے۔ یا قرآن نے جو بیان کیا گیا اسے ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ عیسائی عورتیں بچے مرد سبھی اس جگہ سجدہ کرتے ہیں اسے چومتے ہیں اور اب موبائل فون نے سیلفی کا رواج ڈال دیا ہے۔ اب بجائے سجدے کے زیادہ تر سیلفیاں بنائی جاتی ہیں۔ وہاں سے آگے کئی تاریخی نشانات جو انہوں نے محفوظ کیے ہیں، دکھائے گئے اور ہم چرچ سے باہر آئے تو ایک بگھی رکی جس پر سے ایک نوجوان لاٹ پادری زرق برق لباس پہنے سیکیورٹی گارڈز کے ہمراہ اترا، جیسے ہمارے ہاں دلہن بنے پیران طریقت اترتے ہیں۔ سارا مجمع اس کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب ہو کر اس سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ بتایا گیا کہ کسی یورپی ملک کا مسیحی رہنما ہے۔ پھر اور ہم آگے بڑھ گئے۔ چرچ کے باہر ایک معمر فلسطینی بزرگ مسجد اقصیٰ اور ان علاقوں کی تصاویر بیچ رہا تھا۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے چند سیٹ خرید لیے۔ پھر سڑک پار کر کے 300 گز دور، 3 منزلہ مسجد عمر فاروقؓ میں چلے گئے اور نوافل ادا کیے۔ کہا جاتا ہے کہ کلیسائے مریم میں سیدنا عمر فاروق امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے پادریوں سے مذاکرات کے دوران نماز کا وقت آنے پر لاٹ پادری کی پیشکش پر چرچ کے اندر ہی نماز ادا کرلی تھی۔ جس سے مسلمانوں کے لیے غیر مسلم عبادت گاہوں میں کچھ تحفظات کے ساتھ نماز ادا کرنے کا جواز بنا۔ لاٹ پادری نے اپنی خوشی سے مسجد کی جگہ مسلمانوں کے لیے وقف کر دی۔ جہاں آج خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ جبکہ شہر القدس میں مسجد اقصیٰ کے پڑوس میں واقع کنیسۃ القیامہ میں باوجود پیشکش کے امامنا وسیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نماز ادا نہیں کی۔ کیونکہ حالات کا اختلاف تھا۔

بہر حال خلیفہ اسلام کی رواداری ایک غیر متنازعہ حقیقت ہے جسے آج تک ملت اسلامیہ فخر کے ساتھ پیش کرتی ہے اور اس ملت کا حق ہے کہ وہ اس پر فخر کرے۔ اس مسجد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آرائش سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے دور ہمایوں میں بھی کی گئی تھی۔ اب اسے بہت خوبصورت اور جدید طرز تعمیر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اتنے میں وہاں سے روانگی کا اعلان ہو گیا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ مقام سیدنا موسیٰ علیہ السلام تھا۔

فلسطین کے شہر ''بیت اللحم'' کا تعارف

فلسطین کے مشہور شہر ''بیت اللحم'' سے مقام موسیٰ، اریحا وغیرہ کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہم اس شہر کی تاریخی اہمیت و حیثیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، بیت اللحم کا لفظی معنی تو عجیب سا ہے یعنی گوشت یا روٹی کا گھر یا وہ علاقہ جہاں کثرت سے پھل اور رزق پایا جاتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ بیت اللحم کنعانیوں کے خدا ''لحمو'' یا ''لاخاما'' کی طرف منسوب ہے، یاد رہے کہ آرامی خداؤں میں اس نام کا معبود ''واؤ کی شد کے ساتھ قوّت بمعنی طاقت۔ یا۔ واؤ کے سکون کے ساتھ۔ قُوت (جیسے قوت لایموت۔ نپا تلا رزق) بمعنی

روزی کا معبود سمجھا جاتا تھا۔۔۔وھو إله القوة... أو إله القوت(روزی)وھی کلمة آرامیة تعنی الخصب والثمار۔ عبرانی بائبل کے مطابق یہ کنعانی شہر اسرائیلی بادشاہ "رحبعام" کی طرف منسوب ہے۔ ہم نے بچپن میں بیت اللحم کا نام بائبل میں پڑھا تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت کے طور پر۔ اس لیے جب ہمیں بتایا گیا کہ آج ہم بیت اللحم کے وزٹ کے لیے جارہے ہیں تو ذہن میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس شہر کی تاریخ ، کوئی 1350 سال قبل ولادت مسیح بتائی جاتی ہے۔ یروشلم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے گزشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کے 12 قبیلوں میں جب یہ علاقہ تقسیم ہوا تو یہ علاقہ بنی بنیامین (جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کی اولاد) کے حصے میں آیا تھا۔ اسی لیے اسی علاقے میں سیدنا یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی والدہ سیدنا یعقوب نبی کی زوجہ سیدہ راحیل کی قبر موجود ہے۔ جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ "بیت اللحم "کو شہر داؤد بھی کہا جاتا ہے ، کہا جاتا ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کی ولادت بھی بیت اللحم میں ہوئی تھی۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ایک کنواں بھی ہے اور انہوں نے ایک بہت بڑا محل بھی یہاں بنایا تھا۔ اسی صدی میں اس محل داؤدی کے آثار بھی دریافت ہوئے ہیں۔ شہر بیت اللحم ،یروشلم سے مشرقی جانب صرف 6،7 میل دور ہے، دوسری صدی میں رومی بادشاہ قیصر ہیڈریان نے اسے شہر کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ نبی ﷺ کی ولادت سے 300سال پہلے ایک اور رومی بادشاہ قسطنطین Constantine نے یہودیت چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ اس بادشاہ کی والدہ ہیلن بڑی مذہبی عورت تھی ، اس نے 327عیسوی میں اسے دوبارہ آباد کیا اور 330عیسوی میں جائے ولادت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر گرجا گھر "کنیسة المھد" کے نام سے تعمیر کرادیا۔ یادرہے کہ اسی لیڈی ہیلن نے یروشلم کا کنیسة القیامة بھی تعمیر کروایا تھا۔ ہجرت کے سولہویں سال 637 عیسوی میں، خلیفہ ثانی، فخر امت ،سیدنا واما منا سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد ہمایوں میں اسے بھی یروشلم کے ساتھ فتح کر لیا گیا تھا۔ اس وقت عیسائیوں نے یہاں یہودیوں کا داخلہ بند کیا ہوا تھا۔ لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یروشلم کی طرح بیت اللحم میں بھی یہودیوں پر عائد ہر قسم کی پابندیاں ختم کر دی تھیں۔ اس چرچ میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نماز بھی ادا کی تھی ، جس سے غیر مسلموں کی عبادتگاہوں میں چند شرائط کے ساتھ نماز پڑھنے کا جواز ملتا ہے۔

بیت اللحم میں دور عباسی یعنی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ یہاں کئی مساجد و مدارس قائم کیے گئے ، گیارہویں صدی تک یروشلم کی طرح بیت اللحم بھی مسلم ریاست کا حصہ رہا۔ 1099 عیسوی میں صلیبیوں نے قبضہ کرکے یہاں بھی یروشلم کی طرح بڑی خونریزیاں کیں۔ یونانی آرتھوڈوکس رہنماؤں کو ہٹا کر لاطینی پادریوں کا تقرر کیا جنہوں نے جی بھر کر کفر و جہل پھیلایا۔ پھر سلطان صلاح الدین نے اسے فتح کرنے کے بعد یہاں سے صلیبیوں کے اثرات بد کا خاتمہ کر دیا اور اسے ایک پُرامن شہر ڈکلیئر کیا۔ جہاں تمام مذاہب کو آزادی حاصل رہی۔ 1250 میں ممالیک حکمرانوں (جیسے تاریخ ہند میں خاندان غلاماں کی حکمرانی تھی ، یہی صورتحال شام و نواحی علاقوں میں بھی تھی) نے اس شہر کی دیواریں تباہ کر دیں۔ جنہیں 16 ویں صدی میں خلافت عثمانیہ کے دور میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ یورپی ممالک کی سازشوں کی وجہ سے 1917 میں یہ علاقہ برطانوی فورسز کے قبضے میں آگیا۔ عثمانیوں کا برائے نام ہی سہی، لیکن کنٹرول سمجھا جاتا تھا جو عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ان کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا۔ 1948 میں عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں اردن کو کنٹرول مل گیا۔ لیکن 1967 کی 6روزہ جنگ کے نتیجے میں اسرائیل اس پر قابض ہوگیا۔ 1995ء کے اوسلو معاہدے کے تحت بیت اللحم فلسطینی اتھارٹی کنٹرول میں دے دیا گیا۔ بیت اللحم کی مساحت 10611ایکڑ یا4.097مربع میل ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں 30سے زیادہ ہوٹل 300 سے زیادہ گھریلو صنعتیں،70بستیاں، تین مہاجر کیمپ ایک کا نام "مخیم عایدہ" دوسرا "مخیم بیت جبرین" اور تیسرے کا نام "مخیم الدھیشہ" ہے جو 1949ء اور 1950ء میں قائم ہوئے تھے۔ یہاں 31 تعلیمی مدارس کام کر رہے ہیں ، اعلیٰ تعلیم کے لیے "بیت اللحم یونیورسٹی" بھی ہے۔ جہاں کئی قسم کے علوم وفنون پڑھانے کے لیے مخصوص کالجز ہیں۔

بیت اللحم کی غاریں وخانقاہیں وگرجا گھر

بیت اللحم میں کئی غاریں بھی بڑی مشہور ہیں۔ جنوب مشرق میں ایک "مغارات الحلیب" ہے مشہور ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ اس غار میں دودھ پلایا کرتی تھیں۔ اسی طرح کئی خانقاہیں مختلف ادوار میں بنائی گئی تھیں۔ ایک خانقاہ عبید وادی قدرون کے سامنے ہے۔ یہ خانقاہ عبید نامی گاؤں کی مناسبت سے عبید کہلاتی ہے۔ جبکہ خانقاہ جنت مکمل طور پر بند ہے۔ اور "خانقاہ مارسابا" جو 482عیسوی میں یونانی دور میں تعمیر کی گئی تھی (خاتم النّبیین ﷺ کی ولادت شریفہ سے تقریباً کوئی ایک صدی پہلے)اس خانقاہ کی خاص بات یہ ہے کہ شروع دن ہی سے اس خانقاہ میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے، روایت کے مطابق یہ خانقاہ ابھی تک انہی پرانے اصولوں پر قائم ہے۔ یوں بھی مذہبی طور پر عیسائیت میں عورتوں کو سوائے نن بننے کے کبھی کوئی اختیار نہیں دیا گیا اور مظلوم ننوں کے ساتھ جبر وظلم کی بڑی المناک داستانیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

☆☆☆

ان سب سے بڑھ کر بڑی وجہ ثبوت یہ ہے کہ میں نے یکم دسمبر 1877ء کو (جس کو آج بوقت تحریر سال سے زائد عرصہ ہو لیا ہے) مولوی محمد قاسم کے مؤلف ہونے کا اعلان جاری کیا اور مولوی صاحب نے اس پر سکوت فرمایا اور اس کا خلاف مشتہر نہ کیا، اور نہ خاص میری طرف اس باب میں کچھ لکھا، باوجودیکہ میری ان کی سابق سے خط و کتابت اور ملاقات بھی ہے۔

اس سے بڑھ کر وجہ ثبوت یہ ہے کہ ضمیمہ اشاعۃ السنہ مطبوعہ ذی قعد 1295ھ میں، میں نے بجواب محمود حسن (جنہوں نے مولوی قاسم کے مصنف رسالہ ہو نے کا انکار اور اپنے مئولف ہونے کا اظہار کیا ہے) میں نے صاف لکھ دیا ہے کہ مولوی محمد قاسم مئولف ہو نے سے انکار کریں تو وہ انکار کسی اخبار میں درج کرائیں، یا بذریعہ خط خاص مجھے اس سے اطلاع دیں تو میں اپنے دعوی سے دست بردار ہو جائو نگا۔ اس پر بھی مولوی قاسم کچھ نہیں بولے، گویا میرے بیان کے مصدق ہیں۔

شائد ان وجوہات کے جواب میں حوار یین مولوی محمد قاسم یہ ارشاد کریں کہ جو شان نزول اس قصہ کا کسی نے تمہاری طرف لکھا ہے یہ دروغ ہے اور بیان حاجی ظفر اللہ اور شیخ محی الدین کا بھی خلاف واقع۔

اس کے جواب میں اگر ان شہود کی توثیق و تعدیل کروں یا اور دلائل سے اس دعوی کو ثابت کروں تو ایک بحث طویل ہوتی ہے، جو میرے مقصود سے اجنبی ہے اور ہم رنگ کوہ کندن و گیاہے بر آوردن معلوم ہوتی ہے۔ لہذا میں اس کے جواب میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ بیان شان نزول و اقرار جناب بمشافہ ثقات عدول غلط ہے اور ناقل کا افتراء، تو آپ لوگ اصل حقیقت اس کی مولوی محمد قاسم سے لکھوا دیں اور ان کے قلم کا لکھا ہوا میرے پاس بھیج دیں، یا کسی اخبار میں ان کی طرف سے مشتہر کرادیں کہ یہ رسالہ ہماری تصنیف نہیں ہے اور ہم نے اس کے مؤلف ہونے کا اقرار و اظہار نہیں کیا۔ پس میں انہیں کی شہادت مان جائوں گا اور اپنا یہ دعوی چھوڑ دونگا۔

اس میں اگر کوئی عذر کرے کہ وہ صوفی اور زاہد آدمی ہیں اور ان بکھیڑوں کو فضول سمجھتے ہیں تو دفعیہ اس کا یہ ہے کہ امر حق کا اظہار تو عین لوازم زہد و تدین سے ہے و قاطع فضول بکھیڑوں کا۔ پس جس حالت میں ان کے مجرد انکار پر اس فضول بحث کا انقطاع ہوتا ہے تو اس پر اقدام کرنے سے ان کو کیا عذر۔

با ایں ہمہ وہ انکار نہ کریں اور ساکت رہیں تو ناظرین یقین کر لیں کہ مئولف رسالہ وہی ہیں، اور تشہیر رسالہ بنام مولوی محمود حسن محض کذب ہے۔ مر تکب اس کا خواہ کوئی ہو اور کیسا ہی بڑا مخدوم خلائق، ملک صفت مشہور ہو۔ اس صورت میں ناظرین باانصا ف و منصفین بے اعتساف میرا ان کو مخاطب کرنا بے جا نہ سمجھیں اور اس کو ناحق الجھنا خیال نہ کریں۔

(اشاعۃ السنہ نمبر 1 جلد 2 ۔ 28 محرم 1296ھ مطابق 31 جنوری 1879ء۔ مطبوعہ سفیر ہند پریس امر تسر۔ ص 2 تا 7)

جناب محمد حسین بٹالوی نے ادلّہ کاملہ کا مفصل جواب لکھنا شروع کیا اور وہ اشاعۃ السنہ جلد 2 میں شائع ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں جناب محمد احسن امروہی (جو 1870ء کے عشرے میں اہل حدیث کی صفوں میں شامل تھے) نے مصباح الادلہ کے نام سے ادلہ کاملہ کا جواب لکھ کر کتابی صورت میں شائع کرادیا۔ اس لئے جناب بٹالوی نے اپنی تحریر کو نا تمام چھوڑتے ہوئے اعلان کیا کہ

رسالہ مصباح الادلہ تالیف مولوی سید محمد احسن امروہی بجواب ادلہ کاملہ مولوی محمد قاسم نانوتوی چھپ کر شائع ہو رہا ہے۔۔ میں اس رسالہ کو اکثر لوگوں کے حق میں اپنے رسالہ اشاعۃ السنہ کی نسبت زیادہ مفید سمجھتا ہوں۔۔ مسائل کا کوئی طالب ہو تو اس میں دیکھ لے۔ مناظرہ کا ڈھنگ سیکھنا ہو تو اس سے سیکھے۔ طرز ظرافت مہذبانہ معلوم کرنا ہو، تو اس سے کرے۔ مکرمی شیخ عبید اللہ (نو مسلم) اس کی تقریظ میں کیا خوب لکھتے ہیں:

فقیر نے اس رسالہ کو کلام محقق اور مدلل اور مطابق عقائد اہل سنت اور موافق مذہب سلف صالح کے پایا اور جامع بہت مضامین اور اکثر مسائل ضروریہ کا۔ اگرچہ اس کے بعض مقام میں مثل مولف رسالہ ادلہ کاملہ کے کلام شجاعانہ اور ظرافت آمیز بھی ہے وہر چند یہ امور ادلہ اربعہ شرعیہ میں داخل نہیں ہیں لیکن بے شک اوقع فی النفوس ہوتے ہیں، چنانچہ سعدی نے فرمایا:

بہ پرویزن معرف بیختہ بشہد ظرافت بر آمیختہ

میں (محمد حسین) اس کو اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب دہلی میں مولوی نور محمد ملتانی مقیم مدرسہ مولانا و شیخنا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی، و میر معظم مہتمم مطبع فاروقی سے مل سکتی ہے اور دیرہ دون ضلع سہارن پور میں محمد حنیف سوداگر ولد پیر جی

خدابخش سوداگر بازار دھامون والہ سے مل سکتی ہے اور خاص کر سکنہ پنجاب کو بذریعہ راقم الحروف لاہور مسجد چینیانوالی سے مل سکتی ہے۔ (اشاعۃ السنہ: 2 جلد 2 نمبر 6 ص 187-188)

مباحثہ فرید کوٹ سے متعلق غلط بیانی

مباحثہ فرید کوٹ 1883ء میں احناف کے بڑے مناظر مولوی ولی محمد تھے۔ مناظرے کے بعد وہ اپنی فتح کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے امرتسر جا کر چیلنج بازی شروع کی تو جناب ثناء اللہ امرتسری نے لکھا:

مولوی ولی محمد جالندھری وہی بزرگ ہیں جو ریاست فرید کوٹ پنجاب کے مباحثہ میں از طرف حنفیہ پیش ہوئے تھے۔ اس مباحثہ میں کیا ہوا تھا؟ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مباحثہ مذکورہ کی جو کیفیت مولوی غلام دستگیر قصوری حنفی نے بحکم راجہ صاحب ریاست مذکور لکھی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ولی محمد مغلوب ہوئے اور اہل حدیث کے علماء غالب ہوئے۔ اس کا ثبوت یوں ہے کہ مولوی غلام دستگیر نے رویداد کو اس طرح لکھا ہے کہ فریق اہل حدیث کی تقریر تو بہت تھوڑے لفظوں میں دکھاتے ہیں اور مولوی ولی محمد کی تقریر بڑی طول طویل ایسے طریق سے لکھتے ہیں کہ سمجھ دار اس کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جو کچھ بھی اس کتاب میں ہے مولوی صاحب کی قابلیت کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی محجوب ہے اس پردہ زنگاری میں۔

غرض یہ کہ اس کتاب میں فریقین کی مصدقہ تحریرات نہیں بلکہ اس تصویر کا مصور کوئی اور ہے۔ علاوہ اس کے جو کچھ بھی ہے ایسا ہے کہ اہل حدیث کا ایک ادنیٰ طالب علم جس نے مشکوۃ شریف بھی سمجھ کر پڑھی ہو، اس کا جواب دے سکتا ہے۔ باوجود اس کے مولوی ولی محمد خود اس دفعہ شعبان۔ جولائی 1912ء میں امرتسر تشریف لائے تو آپ نے اشتہار شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ مباحثہ فرید کوٹ کے اثر سے 35 ہزار غیر مقلدین تائب ہوئے۔ پہلے تو ہم 35 ہزار کی تعداد سن کر خاموش رہے اور یہ سمجھا کہ یہ تعداد ہی اس اشتہار کے کذب کی دلیل ہے لیکن مولوی صاحب موصوف نے جب وعظوں میں للکارنا شروع کیا اور ایک اشتہار بھی دیا جس میں موضع ہری کے ضلع لاہور اور خاص شہر لاہور کے مباحثہ کا ذکر تھا، جو انجمن نعمانیہ کے مکان پر ہوا تھا۔ اس اشتہار میں جناب نے خیریت سے 35 ہزار والے اشتہار سے بھی بڑھ کر کذب بیانی کی۔ اس لئے پہلے بذریعہ خط آپ کو مباحثہ کی دعوت دی گئی۔ مگر مولوی صاحب اور مباحثہ؟ ایں چہ بوالعجبی است۔ ہم نے علاوہ اور معمولی شرطوں کے یہ لکھا کہ مباحثہ کے منصف ہم اہلحدیث علماء کو نہ کریں گے بلکہ حنفی علماء کو بنادیں گے جیسے مولانا محمود حسن حنفی دیوبندی یا مولانا خلیل احمد حنفی مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ یا مولانا شبلی نعمانی رکن ندوہ العلماء لکھنؤ۔ اس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں یہ علماء ہم کو منظور نہیں۔ منصفی کے لئے حرمین شریفین کے علماء مقرر ہوں گے۔ مولوی صاحب نے یہ سمجھا کہ فریق ثانی کو حرمین شریفین کے علماء کو منصف ماننے میں تامل ہوگا لیکن ہم نے صاف لکھا کہ حرمین شریفین کے علماء منظور ہیں مگر وہاں کے علماء چونکہ اردو نہیں جانتے اس لئے پرچہ عربی اپنے ہاتھ سے مجلس میں لکھنا ہوگا۔ مولوی صاحب کے استفسار پر یہ دلیل بھی لکھی کہ قرآن مجید میں فاکتبو کا حکم بھی یہی چاہتا ہے کہ جو لکھنا جانتا ہے وہ خود لکھے۔ نیز آپ کے 36 علموں کا روشن سورج اس سے خوب چمکے گا۔ یہ بھی لکھا کہ جتنا وقت ہم لیں گے اس سے دوگنا آپ کا حق ہوگا۔ مگر افسوس مولوی صاحب اس کی تسلیم پر نہ آئے اسی پر بضد رہے کہ ہم خود نہ لکھیں گے۔ کوئی لکھنے والا لکھتا جائے گا ہم بولتے جائیں گے۔ ہم نے جواب دیا کہ آپ کے بولنے کے دوران آپ کے محرر یا مشیر بدلتے جاویں گے تو ایک جھگڑا پیدا ہوگا۔ نیز آپ کی لیاقت کا سورج جس کے آپ مدعی ہیں روشن نہ ہو سکے گا۔ غرض مولوی صاحب اس پر بضد مصر رہے آخر کار امرتسر سے چلتے بنے۔

اب بھی ہم مولوی صاحب سے مباحثہ کرنے کو تیار ہیں علماء حنفیہ دیوبند، سہارنپور یا لکھنؤ کو منصف مانیں تو پرچہ اردو میں لکھیں۔ حرمین شریفین کے علماء کو منصف ماننا ہو تو مباحثہ کا پرچہ مقررہ وقت میں سامنے بیٹھ کر عربی میں لکھیں تاکہ لوگ کہہ سکیں کہ چھتیس علموں کے عالم کی تحریر ایسی ہوتی ہے۔ کیا مولوی صاحب ایسا کریں گے؟ جہاں تک ہمارا خیال ہے ہرگز نہیں۔ خدا کرے ہمارا خیال غلط ثابت ہو۔ مولوی صاحب کو اس پر بھی ضد رہی کہ جلسہ عام ہو اور کوئی رئیس تحریری ذمہ داری ہم کو دے۔ اس کے جواب میں ہم یہی کہتے رہے کہ عام جلسوں میں فساد کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ہم اس کے خواہش مند نہیں۔ اگر آپ کو شوق ہو تو آپ انتظام کریں ہم حاضر ہو جائیں گے۔ مگر مولوی صاحب یہی بہانہ کرتے رہے یہاں تک کہ امرتسر سے کوچ کر گئے۔

(اہل حدیث امرتسر 23-30۔ اگست 1912ء ص 3-4)

☆☆☆